[illegible]

[illegible]

رُباعیاتِ محرومؔ

تلوک چند محرومؔ

رسالہ "بیسویں صدی" نئی دہلی

پہلی بار مکتبۂ دانش لاہور ۱۹۴۷ء

دُوسری بار ۱۹۵۴ء

پرنٹر :- محبوب المطابع برقی پریس اُردو بازار- دہلی
پبلشر :- رسالہ بیسویں صدی ترکمان گیٹ نئی دہلی
کتابت :- ہمّت رائے مسافر گپتا کالوفی سول لائنز دہلی

فہرستِ مضامین

حرفِ آغاز

شغلِ بے جا نہیں سخن آرائی
قدرت کی اگر ہو یہ کرم فرمائی
آغاز اُسی کے نام پر ہے، جس نے
بخشی ہے مُشتِ خاک کو گویائی!

دادِ سخن

ہے داد کا مستحق کلامِ محروم
لفظوں کا جمال اور معانی کا ہجوم
ہے ان کا سخن مفید و دانش آموز
ان کی نظموں کی ہے بجا ملک میں دھوم!

اکبر الٰہ آبادیؒ

شکریۂ دادِ سخن

طبعِ موزوں خدائے برتر سے ملی
تاثیرِ کلام قلبِ مُضطر سے ملی
آیا مُجھ کو یقیں کہ شاعر ہُوں میں
جب دادِ سخن جنابِ اکبرؔ سے ملی !

محمودؔ

دیباچۂ طبعِ اوّل

فارسی شاعری میں رُباعی بہت پرانی چیز ہے، عروضیوں نے تو اِس کی بحر کو عربی اوزان سے نکالا ہے، لیکن جدید تحقیقات نے یہ عقیدہ پیدا کر دیا ہے کہ رباعی کا وزن اسلامی زمانے سے پہلے کا ہے۔ اس عقیدے کو کوئی مانے یا نہ مانے بہر حال یہ مُسلّم ہے کہ رُباعی خالص ایرانی چیز ہے، وہ ایران ہی میں پیدا ہوئی اور وہیں اس نے پرورش پائی، اس کا نام اگرچہ عربی نام ہے لیکن یہ نام اسے بہت بعد کے زمانے میں دیا گیا۔

تیسری چوتھی صدی ہجری کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی کو اس زمانہ میں ترانہ کہتے تھے اور بالعموم اسے گانے کے لئے تصنیف کیا جاتا تھا، جیسے

آج کل ٹھمری یا گیت، موسیقی میں وہ بہت مقبول چیز تھی، لیکن فارسی شاعری میں رفتہ رفتہ اس میں ایسی وسعت اور ہمہ گیری پیدا ہوئی کہ قصیدہ اور مثنوی تو درکنار، غزل بھی اس کے سامنے ناچیز ہو کر رہ گئی، مدح و ذم، عشق و تصوّف، مذہب و اخلاق اور پند و نصائح کے مضامین جس خوش اسلوبی دلفریبی اور اختصار کے ساتھ فارسی رباعی میں ادا ہوئے ہیں وہ کسی دُوسری شکل میں ادا نہیں ہو سکے۔

اُردو میں اگرچہ شاعری کے دوسرے شعبوں نے بلے انتہا ترقّی کی لیکن رباعی کو وہ رُتبہ نصیب نہ ہُوا جو اُسے فارسی میں حاصل تھا۔ فارسی میں بیسیوں ایسے شاعر گذرے ہیں جنہوں نے محض رُباعی گوئی کی بدولت لازوال شہرت حاصل کی۔ شیخ ابو سعید، خیّام، افضل کاشانی، سحابی اور سرمد کی عالمگیر شہرت صرف رباعی کی بناء پر ہے۔ لیکن اردو میں کسی ایسے شاعر کا نام نہیں لیا جا سکتا، اور جہاں تک مجھے علم ہے مولانا حالیؔ اور اکبرؔ الہ آبادی کے سوا کسی اور اُردو شاعر کا مجموعۂ رباعیات شائع ہو کر مقبولِ عام نہیں ہُوا۔

بڑی خوشی کا مقام ہے کہ اب رباعیاتِ محترم کی اشاعت سے اُردو شاعری اور خصوصاً اردو رُباعیوں کے ذخیرے میں ایک گراں قدر اضافہ

ہو رہا ہے۔ جنابِ محشر مرحوم کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ ان کا شمار اب ملک کے نامور اساتذۂ سخن میں ہے، ان کے کلام کی پختگی اور زبان کی دلآویزی اُردو ادب کے ہر شیدائی سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ محشر مرحوم کا نام ہی اس امر کی کافی ضمانت ہے کہ ان کا یہ جدید مجموعۂ رباعیات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے کی چیز ہے۔

رُباعیاتِ محشر مرحوم کا شاعرانہ معیار بہت بلند ہے، فلسفۂ اخلاق، مذہب اور روحانیت کے وہ نکتے جنہوں نے فارسی رُباعیوں کو اس قدر پُرمعنی بنایا، ان میں جابجا ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

دروازۂ نجات کا بیاباں میں نہیں
دل کا آرام قصر و ایواں میں نہیں
تسکیں جنّت میں بھی نہیں مل سکتی
جب تک موجود قلبِ انساں میں نہیں

دُنیا نے عجب رنگ جما رکھا ہے
ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے
اس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھا ہے

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے
حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے
خوف اس کو گناہ سے نہیں ہے لیکن
الزامِ گناہ سے بہت ڈرتا ہے

انکارِ گناہ بھی کئے جاتا ہوں — تکرارِ گناہ بھی کئے جاتا ہوں
حاصل ہو ثوابِ مفت، اس لالچ میں — اقرارِ گناہ بھی کئے جاتا ہوں

ظاہر میں قضا بہت ستم ڈھاتی ہے — جاں سن کے اجل کا نام ڈر جاتی ہے
لیکن ہر موت کا نتیجہ ہے حیات — ہر شام پیامِ صبحِ نَو لاتی ہے

بد خواہ نہیں خالقِ اکبر اپنا — غائب ہو کر بھی ہے وہ رہبر اپنا
ہم خود ہیں بُرے تو ہے مقدّر بھی بُرا — اچھے ہیں تو اچھا ہے مقدّر اپنا

ادبار کا گھر، کہ جائے اقبال ہے دہر — جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر
کیوں زشتیٔ دہر پر ہے برہم اتنا — ناداں ترا آئینۂ اعمال ہے دہر

آئینہ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف — کر دے اہلِ ریا کے کینوں کو معاف
دنیا میں نہ کر کسی سے بے انصافی — دنیا سے مگر نہ رکھ امیدِ انصاف

محروم کو اپنی زندگی میں بہت سے جانکاہ صدمے دیکھنے پڑے ہیں، جن

ولت اظہارِ یاس و الم ان کے کلام کا ممتاز جوہر بن گیا ہے، رباعیات میں
بعض جگہ اس کی جھلک نظر آتی ہے، ملاحظہ فرمایئے :-

درکار جگر تھا زخم کاری کے لئے ۔۔۔ تیار نہ تھا جگر فگاری کے لئے
محروم! خوشی اس کو کس طرح میں رکھتا ۔۔۔ جو عمر ملی تھی سوگواری کے لئے

حیراں ہوں کیا کیا خدا یا میں نے ۔۔۔ بے فائدہ عمر کو گنوایا میں نے
پیری بھی قریبِ خاتمہ آ پہنچی ۔۔۔ منزل کا نشاں ابھی نہ پایا میں نے

کب کوئی جہاں میں چھوٹتا ہے غم سے ۔۔۔ دل آخرِ کار ٹوٹتا ہے غم سے
صدمات سے کھلتی ہیں بشر کی آنکھیں ۔۔۔ پھوڑا غفلت کا پھوٹتا ہے غم سے!

محروم کی رباعیاں ان کی ادھیڑ عمر کا کلام ہیں اس لئے ان میں عشقیہ
ریفانہ عنصر موجود نہیں ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے نئی تہذیب خصوصاً
زِ نسواں کی بے حجابی اور بے باکی پر نفرین کی ہے۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ
وان طبقے کے لئے ان کے خیالات قابلِ قبول نہیں ہوں گے۔ لیکن ہم جانتے
ں کہ یہ صرف وقت کی تاثیر ہے، اخلاق اور حکمتِ عملی کی جو صداقتیں

انہوں نے بیان کی ہیں خواہ کسی کو اچھی لگیں یا نہ لگیں لیکن آخر ہر پھر کر وہی انسانی زندگی کا دستور العمل بنتی ہیں۔

کوئی شک نہیں کہ جناب مخدوم کی رُباعیاں ان کے دوسرے کلام کی طرح بہت جلد دِلوں کو مسخّر کریں گی۔

محمد اقبال

اورنٹیل کالج لاہور
۲۵ر اپریل ۱۹۴۲ء

دیباچۂ طبعِ ثانی

(علّامہ برج موہن دتّاتریہ کیفی)

رُباعی ایسی صنف ہے جو تخیّل کی بلندی اور بیان کی پختگی چاہتی ہے۔
ی وجہ سے عموماً اس کی طرف کم توجہ ہوتی ہے۔ یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ جیسے
عیوں کے مجموعے فارسی میں ملتے ہیں ایسے اور اتنے مجموعے اُردو میں نہیں
ﺴﺮ آتے۔ لیکن کہنے والا یہ بھول جاتا ہے کہ فارسی اور اُردو کی عمروں
کتنا فرق ہے۔ پھر بھی اُردو نظم کا ذخیرہ رُباعی کے مجموعوں سے خالی نہیں۔
نیسؔ نے بہت رُباعیاں کہیں اور ایسی کہیں کہ رُباعی کہنے کا حق ادا
۔ ان کے ہاں اکثر چوتھا مصرع رباعی کو چوتھے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔

حالی مطلب سے مطلب رکھتے تھے۔ اُن کی رباعیاں ان کے اصلاحی مفہوم کی پوری عکاسی کرتی ہیں۔ اکبر اپنے رنگ میں چوکھے ہیں۔ رباعیوں کے دو اولے مجموعے اس صدی میں شائع ہوئے ہیں جو بہت قابلِ قدر ہیں۔ ایک کے مصنف رواں لکھنوی ہیں اور دوسرے کے آثر صہبائی۔ ان کے ہاں شباب کے ولولے، جذبات کی بے تابی کے ساتھ حُسنِ ادا اور خیالات کی بلندی بھی موجود ہے۔ اب جناب محشر وم کی رباعیات کا مجموعہ شائع ہوتا ہے۔

محشر وم صاحب دُنیائے ادب میں تعارف کے محتاج نہیں۔ آپ اُردو ادب کی دُنیا میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں جس کی وقعت اور عظمت سب کو تسلیم ہے۔ آپ کی طبیعت ہمہ گیر اور آپ کا تخیل بلند و مستحکم اور بیان دل کش ہے۔ آپ کا شمار ان اساتذہ میں ہے جن کی غایر نظر حال اور مستقبل تک پہنچتی ہے۔ آپ کے کلام کی پختگی اور اسلوب کی دل آویزی ملک کے نقادوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ آپ کی ذہنیت توازن اور آپ کا شعور اعتدال سے مزین ہیں۔ جن اوصاف اور اقدار کی رباعی کے لئے ضرورت ہے وہ آپ میں بہ درجۂ اتم موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ

کے اور کلام کی طرح رباعیاں بھی نہایت پسند کی جاتی ہیں۔ آپ کا مجموعۂ رُباعیات کا یہ دُوسرا اڈیشن چھپ رہا ہے۔ اُردو کو یہ اضافہ مبارک ہو۔

بلند آہنگی اور لفظی گورکھ دھندے سے آپ ہمیشہ دُور دُور رہے۔ چنانچہ ان کا نشان آپ کی رُباعیوں میں بھی نہیں ملے گا۔ وقتِ نظر اور معنویت کی آپ کے ہاں کمی نہیں۔ چند رباعیاں اِدھر اُدھر سے اُٹھا کر یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

بندگی کے احساس کے ساتھ جذبۂ خودی کے تیور ملاحظہ ہوں:۔

زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے ۔۔۔ یہ ڈوب کے ہیں پار اُترنے والے
بے خوف رہی ہیں جن کو ہے خوف ترا ۔۔۔ کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے

آج کل کے تمدّن میں انسان جس حالت کو پہنچا ہے اس کا نقشہ کس صفائی اور سچّائی سے کھینچا ہے :۔

حاصل کتنا کمال انساں نے کیا ۔۔۔ افلاک کو پائمال انساں نے کیا
یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں ۔۔۔ انساں کو تباہ حال انساں نے کیا؟

اور :۔

ہے رحم و کرم سے آج بیزار انساں
انساں سے ہے خود برسرِ پیکار انساں
دنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے
کس منہ سے ہے جنت کا طلبگار انساں!

اخلاقِ احسن کے باب میں کیا خوب کہا ہے :-

آئینۂ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف
کر دے اہلِ ریا کے کینوں کو معاف
دنیا میں کسی سے کر نہ بے انصافی
دنیا سے مگر نہ رکھ امید انصاف!

دنیا کو اس کی خرابیوں کی وجہ سے برا نہیں کہا بلکہ اور کسی کو ملزم ٹھہرایا ہے :-

دنیا تھی یہی صدق و صفا کی دنیا
رحم و کرم و مہر و وفا کی دنیا
انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو
جور و ستم و کذب و ریا کی دنیا

فکر و نظر کی وسعتیں ملاحظہ ہوں :-

کھلتا یہ رازِ علم و حکمت پہ نہیں
جب تک کرمِ خاص بصارت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعدِ فکرِ بسیار
پردہ آنکھوں پہ ہے، حقیقت پہ نہیں

تقدیر کا رونا کون نہیں روتا مگر آپ کا نقطۂ نظر عاملانہ ہے :-

کیوں سب کو سنائیں حالِ ابتر اپنا
جب اس میں قصور ہو سراسر اپنا
ہم کوستے ہیں عبث مقدر کو ندیم
اعمال سے بنتا ہے مقدر اپنا!

اور :-

پاداشِ عمل کی ہے یہ منزل اے دوست
قدرت کا ہے انتظام کامل اے دوست
اعمالِ بد اپنے بھول جاتے ہیں ہم
قدرت ان سے نہیں ہے غافل اے دوست!

جبر و اختیار بہت پامال مسئلہ ہے۔ آپ نے اس میں ندرت کا رنگ چمکایا ہے:۔

مختار تھا کر گیا جو دل کو بھایا
ہو کر مجبور پھل بھی اس کا پایا
یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا
یوں عالمِ اختیار میں جبر آیا!

مذہب کے بارے میں کیا خوب فرمایا ہے:۔

مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام
حُسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام
مذہب کے نام پر لڑائی کیسی
مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام

پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے جو بد عنوانیاں ہماری تہذیب و تمدّن میں داخل ہونے لگیں۔ ان کی شکایت اس طرح کرتے ہیں:۔

تغیّر پسند ہے زمانے کا مزاج
تبدیل ہوئے جاتے ہیں سب رسم و رواج
پہلے تھا جنونِ عشق عریانی کوش
برہم زن ہوش حُسنِ عریاں ہے آج!

یہ مانتے ہیں کہ:۔

اس دورِ کمالات میں پیدا ہوں میں
لغزشِ قدمِ قدم کا جویا ہوں میں
سائنس کی تم ترقیاں گنواؤ
انساں کی مصیبتوں کو گنتا ہوں میں!

مخدوم صاحب خیر سے بڑے زاہد خشک نہیں ہیں کس تڑپ کے ساتھ کہتے ہیں :-

جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں — ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد میں گزری ہوئی برساتوں کی — آنکھیں مری سیلِ اشک برساتی ہیں!

کوئی یہ نہ سمجھے کہ مخدوم صاحب" ادب برائے زندگی" کے قائل نہیں - یہ دو رُباعیاں ملاحظہ ہوں :-

آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی — مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی
مصنوعی ہیں زندگی کے سارے ساماں — کیونکر نہ ہو اپنی زندگی مصنوعی!

اور :-

ہرگز نہیں دور بیں نگاہِ انساں — روشن تقدیر پہ ہے راہِ انساں
تقدیر نے گندم کو کیا ہے کمیاب — گندم تھی باعثِ گناہِ انساں!

آخر میں یہ کہنا ہے کہ دُنیا میں معاشرے کے تقاضے بدلتے رہتے ہیں، ادب کی قدریں بدلتی رہتی ہیں - لوگوں کے ذوق اور پسند بھی بدلتے رہتے ہیں - لیکن ادب کے وہ کارنامے جو جان دار ہوں اور شعور کی سچائی کا جوہر رکھتے ہوں اُن کی قدر اور وقعت ہمیشہ برقرار رہتی ہے - لوگ شاعر

کو بھول جاتے ہیں مگر اُس کے شعر گنگناتے رہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ صحیح مذاقِ سخن رکھنے والے محروم صاحب کے ادبی کارناموں سے ہمیشہ مستفید رہیں گے اور اُردو نظم میں اس اضافہ کو مبارک سمجھا جائے گا۔

کیفیؔ

دہلی
۱۴-اگست ۱۹۴۹ء

حمد و مناجات

Kashmir

University of Library

Library

Library

ہر راہ میں ہے راہ نُما نام ترا

ہر آہ میں ہے عُقدہ کُشا نام ترا

تسکیں میں ترا خیال تسکیں افروز

اندوہ میں اندوہ رُبا نام ترا!

ہر دُکھ میں ہے نسخۂ شفا نام ترا
ہر درد کی بلکہ ہے دوا نام ترا
ہر چیز پہ اندوہِ فنا طاری ہے
سرمایۂ دولتِ بقا نام ترا!



ہر شیخ بلند جب علَم کرتا ہے
سر تیرے حضور اُٹھ کے خم کرتا ہے
لوحِ افلاک پر شعاعی خط ہیں
خورشید تری ثنا رقم کرتا ہے!

دروازے پہ تیرے اک جہاں جھکتا ہے
اُونچے اُونچوں کا سر یہاں جھکتا ہے
کیونکر نہ جھکے، زمیں کی وقعت کیا ہے
باعجز و نیاز آسماں جھکتا ہے!



ہنگامہ ترا ہی گرم ہر اک سُو ہے
تیرے دم سے ہے جتنی ہا و ہُو ہے
دِل سے پیہم یہی صدا اُٹھتی ہے
تُو ہی تُو ہے، جہاں میں تُو ہی تُو ہے!

ہے طبعِ سخنورانِ نامی عاجز
جامی و نظامی و گرامی عاجز
میدانِ ثنائے قادرِ مطلق میں
عاجز ہے قادر الکلامی، عاجز!



ہے تیرے کرم پہ انحصارِ ہستی
رحمت تری باعثِ مہارِ ہستی
حکمت یہ تری ہے اے حکیمِ مطلق!
ذرّوں سے بنا دیا حصارِ ہستی!

پھولوں کے ورق ہیں دفترِ بے معنی

اجرامِ فلک ہیں پیکرِ بے معنی

پڑ جاتی ہے نام سے ترے جاں اس میں

ورنہ یہ جہاں ہے منظرِ بے معنی!



کیا ابرِ بہار جھوم کر آیا ہے

دامن میں لئے زمیں گہر لایا ہے

ابر و باراں پہ کس کو قدرت حاصل

رحمت تیری ہے جس نے برسایا ہے!

مجرم ہوں، سیاہ کار ہوں، رحمت کر!
عاجز ہوں، گناہ گار ہوں، رحمت کر!
حاضر ترے در پہ لے خداوندِ کریم
با دیدۂ اشک بار ہوں، رحمت کر!



قاری ہوں میں نہ بید خواں ہوں یارب!
ناواقفِ اسرارِ نہاں ہوں، یارب!
عاصی ہوں، نظر ہے دامنِ رحمت پر
جویندۂ گوشۂ اماں ہوں، یارب!

اے خالقِ پاک! اے خداوندِ کریم!
حقّا کہ تو ہے قدیر و یکتا و قدیم
آلودۂ صد ملالِ ظُلمت ہوں میں
تو نور و سُرور کا ہے دریائے عظیم!



دھو لیتے ہیں جب کہ پیرہن مَیلا ہو
کر لیتے ہیں صاف جب بدن مَیلا ہو
اے خالقِ پاک! تیری رحمت کے بغیر
کیونکر ہو پاک جب کہ مَن مَیلا ہو

رنگ و بوئے گلستانِ ہستی تو ہے
آرائشِ جا و دانِ ہستی تو ہے
حیراں ہوں یہ موت کیا بلا ہے جب خود
روحِ آفاق و جانِ ہستی تو ہے!



زندہ ہیں تری رضا پہ مرنے والے
یہ ڈوب سکے ہیں پار اُترنے والے
بیخوف وہی ہیں جن کو ہے خوف ترا
کس سے ڈرتے ہیں تجھ سے ڈرنے والے!

جمعیتِ دل کا کوئی ساماں کر دے
ہر مجمعِ یاس کو پریشاں کر دے
آساں کو کیا ہے بخت بدلے مشکل
یارب! مری مشکلوں کو آساں کر دے



قائل ہم بھی ہیں دوزخ و جنّت کے
معنی کے ہیں معتقد، نہیں صورت کے
دوزخ؟ تاریکیاں تری دُوری کی
جنّت؟ انوار ہیں تری قربت کے!

اے خالقِ ذوالجلال وہ اے ربِّ غفور

ہے تیرے کرم سے جملہ نیرنگِ ظہور

ہے رحمتِ عام کارفرما تیری

محروم ہوں میں تو اس میں میرا ہے قصور



ایسے بھی ہیں جن کو ہے مے جام سے کام

ایسے بھی ہیں لاکھوں ہے جنہیں کام سے کام

کر مجھ کو عطا اپنے کرم سے وہ دِل

ہو جس کو تری یاد تِرے نام سے کام!

اے روشنئ شعور دینے والے

ذرّوں کو ضیائے طُور دینے والے

دیدار طلب ہے چشمِ حیراں میری

اے شمس و قمر کو نُور دینے والے!



مشرق کو شدائدِ فرنگی سے بچا

مغرب کو مکائدِ نہنگی سے بچا

اے خالقِ پاک فطرتِ انساں کو

روباہی و گرگی و پلنگی سے بچا!

اِنسان

ہے نازشِ کائنات یہ پیکرِ خاک

دُھوم اس نے مچا رکھّی ہے زیرِ افلاک

یہ دارِ فنا، یہ اس کی بزم آرائی

غافلِ انجام سے ہے یا ہے بیباک؟

ہے کارگہِ دہر میں مزدور انساں
ہستی پہ ہے اپنی پھر بھی مغرور انساں
مختار ہے ایک خاص حد تک بیشک
لیکن حد سے سوا ہے مجبور انساں !



سرمایہ پرست ہو کہ مزدور انساں
ہے دائرۂ عمل میں محصور انساں
تدبیر کے کاروبار میں ہے مختار
تقدیر کے سامنے ہے مجبور انساں

انساں ہے تمیزِ نیک و بد سے انساں
ورنہ بدتر ہے دام و دد سے انساں
عقلِ محدود کا تقاضا ہے یہی
گزرے ہرگز نہ اپنی حد سے انساں



کالا انساں ہو یا کوئی زرد انساں
رنگت میں یا ہو چاند کی گرد انساں
خارج انسانیت سے اُس کو سمجھو
انساں کا اگر نہیں ہے ہمدرد انساں

پرّاں ہو خواہ آسماں پر انساں

ہو خواہ سمندر کا شناور انساں

انسانیت اس میں نہیں جب تک اے دوست

مُرغ و ماہی سے ہے فروتر انساں !



حاصل کتنا کمال انساں نے کیا

اَفلاک کو پائمال انساں نے کیا

یہ عقل مگر ابھی نہیں آئی کہ کیوں

انساں کو تباہ حال انساں نے کیا!

فریاد ہے کس لئے درِ یزداں پر

الزام تراشتے ہو کیوں شیطاں پر

یزداں نے کئے کبھی، نہ شیطاں نے کئے

انساں نے کئے ہیں جو ستم انساں پر



حُسنِ ظاہر سے ہے درخشاں انساں

باطن کو کر چکا ہے ویراں انساں

رکھتا نہیں حیف اُس حقیقت پہ نظر

بے صدق و صفا نہیں ہے انسان انساں

انساں نے درندوں کے چلن سیکھ لیئے
اطوارِ رضائے اہرمن سیکھ لیئے
اپنے علم و ہنر پہ خوش ہے ناداں
بربادیٔ دو جہاں کے فن سیکھ لیئے



ہے رحم و کرم سے آج بیزار انساں
انساں سے ہے خود برسرِ پیکار انساں
دُنیا کو بنا دیا ہے دوزخ اس نے
کس منہ سے ہے جنت کا طلبگار انساں!

اڑتے دیکھا جو طائرِ پرّاں کو

اڑنے کی اُمنگ ہے اٹھی انساں کو

گولے برسا دیئے زمیں پر اُس نے

پرواز نصیب جب ہوئی ناداں کو

-



کرتا ہے ہُنر سے اپنے سیرِ افلاک

چھیڑتا ہے بحر و بر میں کیسا بیباک

لیکن بے بس ہے یوں اجل کے آگے

جیسے طوفاں کے سامنے ہو خاشاک

ہنس ہنس کے بڑی مصیبتیں سہہ جانا

اللہ تک اپنی ذات کو کہہ جانا

انجامِ بشر یہ ہے کہ بے بس ہو کر

طوفانِ فنا میں مثلِ خس بہہ جانا!



دارائے زمیں ہو یا فلک رس انساں

غرقِ عصیاں ہو یا مقدّس انساں

محوِ غفلت ہو یا ہو چوکس انساں

تقدیر کے سامنے ہے بے بس انساں!

خدمت گرِ انساں ہے زمانہ سارا
ہر ذرّہ زمیں کا چرخ کا ہر تارا
راحت کی ہوس میں چھوڑ کر راحت کو
پھرتا ہے کہاں کہاں یہ مارا مارا!

مذہب



دُنیا کے حق آگاہوں کا مذہب ہے ایک
تعلیمِ خدا رسی کا مکتب ہے ایک
تفریق کے ہیں بہت بہانے، ورنہ
اللہ کہو کہ اوم، مطلب ہے ایک!

ہے منزلِ دو جہاں کا رہبر مذہب
دیتا ہے ہمیں مقام برتر مذہب
عقبےٰ میں امیدِ خیر اس سے کیا ہو
دنیا میں اگر ہے حامیٔ شر مذہب!



مذہب کا عمل جہاں کہیں ہوتا ہے
فتنہ داخل وہاں نہیں ہوتا ہے
اغراض سے بے نیاز، آلام سے پاک
جنّت وُہ خطّۂ زمیں ہوتا ہے!

مذہب کی زباں پر ہے نکوئی کا پیام

حسنِ عمل اور راست گوئی کا پیام

مذہب کے نام پر لڑائی کیسی

مذہب دیتا ہے صلح جوئی کا پیام!



لڑتے نہیں واقفِ مقام آپس میں

برہم ہوتے ہیں کج خرام آپس میں

مذہب کے نام پر بحکمِ ابلیس

لڑتے ہیں نفس کے غلام آپس میں!

مذہب ہے فقط حسنِ عمل کا حامی
ہرگز وہ نہیں اہلِ دغل کا حامی
دنیا کو پیامِ امن پھر دے گا کون
مذہب ہو اگر جنگ و جدل کا حامی!



قائل ہم ذاتِ پاکِ یزداں کے ہیں
عامل فرمودہ ہائے شیطاں کے ہیں
کہنے کو تو ہندو بھی مسلماں بھی ہیں ہم
پابند نہ دھرم کے نہ ایماں کے ہیں!

دُنیا

دُنیا نے عجب نقش جما رکھّا ہے

ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھّا ہے

پھر لُطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو، وُہ کہے

اِس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھّا ہے!

دُنیا تھی یہی صدق و صفا کی دُنیا

رحم و کرم و مہر و وفا کی دُنیا

انساں نے بنا دیا بالآخر اس کو

جور و ستم و کذب و ریا کی دُنیا!



سب جانتے ہیں کہ بے بقا ہے دُنیا

سب مانتے ہیں کہ بے وفا ہے دُنیا

ترکِ دُنیا کے مدّعیوں میں بھی

اکثر ہیں کہ جن کا مدّعا ہے دُنیا!

ہے بحرِ رواں، نہیں ہے ساحل دُنیا

ہے راہِ سفر، نہیں ہے منزل دُنیا

رہتا آخر کوئی تو محفوظ اِس میں

ہوتی جو مقامِ امن اے دل دُنیا!



ناکام نہیں جو، آرزو کس کی ہے؟

ہمدوشِ مُراد جستجو کس کی ہے؟

شیدا ہر ایک ہے ترا اے دُنیا

لیکن نہ کھُلا یہ راز۔ تو کس کی ہے؟

جو کچھ کہ ہے مستعار دیتی دُنیا

ہے وقتِ سفر سنبھال لیتی دُنیا

دانا ہے تو تخمِ خیر بوئے جا تُو

آخر ہے آخرت کی کھیتی دُنیا!



پیش آئی جہاں میں جا و بیجا مشکل

جس سے ہوئی زندگی سراپا مشکل

ہے منزلِ مشکلاتِ دُنیا لیکن

مُشکل ہے پھر بھی ترکِ دُنیا مُشکل!

اے ذوقِ غم و وفا سے عاری دُنیا
شیوہ ہے ترا ستم شعاری دُنیا!
پُر داغ جگر ہے اور دل ہے مجروح
سب تیرے کرم ہیں، میری پیاری دُنیا!



یہ حسرت و اندوہ و الم کی دُنیا
اس سے تو ہے خوب تر عدم کی دُنیا
آباد رکھ اس کو خواہ کر دے برباد
دُنیا میری ہے رنج و غم کی دُنیا!

جذبات

محرومؔ! بہارِ نوجوانی کب تک
اِس دارِ فنا میں زندگانی کب تک
تنگ آکے کرے گی قافیہ موت اک دن
یہ طبع رواں، یہ شعر خوانی کب تک!

رنگینیٔ بزمِ رنگ و بو کس کی ہے؟

مرغانِ چمن میں گفتگو کس کی ہے؟

ہے لالے کے دل میں داغِ حسرت کس کا!

نرگس حیرانِ جستجو کس کی ہے؟



ہنگامۂ دہر ہاؤ ہو کس کی ہے؟

وقفِ تگ و تاز آرزو کس کی ہے؟

کیوں روزِ ازل سے پھر رہے ہیں دونوں؟

خورشید و قمر کو جستجو کس کی ہے؟

وارفتۂ غم ہے دلِ نالاں کس کا؟

پابندِ وفا ہے طائرِ جاں کس کا؟

بھاری ہے بارِ زندگانی محروم

معلوم نہیں کہ ہے یہ احساں کس کا!



خورشید و قمر کی روشنی ہے جاں بخش

تاروں میں عیاں جھلک وہی ہے، جاں بخش

کہلائے نہ کیوں حسنِ ازل جانِ جہاں

جب پرتوِ عکس سرسری ہے، جاں بخش!

وہمِ دل وقفِ یاس رکھتا ہے مجھے

محوِ غم ہا بے قیاس رکھتا ہے مجھے

کچھ بھی ہوں کشتۂ تغافل تو نہیں

میں خوش ہوں کہ تو اُداس رکھتا ہے مجھے!



موجود ہے گرچہ دل مرے سینے میں

عالم ہے بے دلی کا اس جینے میں

مدّت سے ہے آرزوئے محرمِ حزیں

تصویر تری ہو دل کے آئینے میں!

ہے ہے! کیا دلنشیں ادائے گل ہے
زینتِ بخشِ چمن، لقائے گل ہے
کیا حسن ہے، کیا لطافت، اللہ اللہ
اے وائے کہ مختصر بقائے گل ہے!



دل منتظر[1] اب بہارِ رنگیں کا ہے
ہنگامِ شگفتِ گل و نسریں کا ہے
اے باغ کے خوشنواؤ! آؤ، چہکو
صیاد کا ڈر نہ خوف گلچیں کا ہے!

[1] بہ تقریبِ آزادیٔ ہند

پھولوں کا لئے نکھار آئے گی بہار

کٹ جائیں گے خارزار آئے گی بہار

مایوس نہ ہو کہ ایک دن آخرِ کار

اے منتظرِ بہار، آئے گی بہار!



پھولوں کا نکھار لے کے آئی ہے بہار

گلبانگِ ہزار لے کے آئی ہے بہار

پھر ہوتی ہے دل میں اک خلش سی محسوس

شاید کوئی خار لے کے آئی ہے بہار!

پھُولوں کے ہار لے کے آئی ہے بہار

گلشن کا رشنگار لے کے آئی ہے بہار

دل کش مانندِ زلف و رُخسارِ بُتاں

کیا لیل و نہار لے کے آئی ہے بہار!



مرغانِ بہار کی نواؤں کی قسم

امواجِ نسیم کی اداؤں کی قسم

مستی اپنی نہیں ہے ممنونِ شراب

ساون کی مدھ بھری ہواؤں کی قسم!

جلوے دیکھے جو صُبحدم پتھّر کے
بُت خانے میں ہو گئے قدم پتھّر کے
اِن زندہ بتوں کو کیا کہو گے محرم
کہلاتے ہیں جب خدا صنم پتھّر کے



کیا رنگ ہے سبزہ زار میں شبنم کا
قطرہ نذرِ فنا ہُوا جب چمکا
یہ سیر نہیں مری نظر میں محرم
نقشہ ہے بے ثباتیٔ عالم کا!

ہے صبحِ بہار جلوہ افگن، محرم!

رشکِ خلدِ بریں ہے گلشن، محرم!

اس جوشِ بہار میں، وفورِ گُل میں

کانٹے ہیں اور اپنا دامن، محرم!



اُلفت کا چمن اُجڑ گیا ہے یا رب!

رنگِ گُل پھیکا پڑ گیا ہے یا رب!

گلشن میں چلی ہوائے نخوت ایسی

ہر غنچے کا مُنہ بگڑ گیا ہے یا رب!

نیرنگیٔ سیمیا ہے سیمائے چمن
رنگینیٔ دھوکا ہے نقشِ زیبائے چمن
اے بادِ نسیم! اے مسیحائے چمن!
مہماں کوئی دم کے ہیں گلہائے چمن!



ہر حلقۂ زلفِ عنبریں دھوکا ہے
ہر عشوۂ چشمِ سرمگیں دھوکا ہے
ہیں زشت و زبوں تمام دھوکے لیکن
کہتے ہیں جسے حسنِ حسیں دھوکا ہے!

معموُر ہے خار و خس سے دامانِ چمن
صحرا ہے ہر اک گوشۂ ویرانِ چمن
بُوم و زاغ و زغن کا بالا ہے بول
پابستۂ قفس ہیں سب مُرغانِ چمن



با جوش و خروش آئے ہیں پھر بادل
غارت گرِ ہوش آئے ہیں پھر بادل
فطرت برسا رہی ہے مستی ہر سُو
مے خانہ بدوش آئے ہیں پھر بادل!

جب فصلِ بہار گُلفشاں ہوتی ہے
یا جب برسات اُنسِ جاں ہوتی ہے
فطرت کس درجہ دل ستاں ہوتی ہے
اک سال میں دوبارہ جواں ہوتی ہے!



جب کالی گھٹائیں جھوم کر آتی ہیں
ساون کا گیت کوئلیں گاتی ہیں
تب یاد ہیں گزری ہوئی برساتوں کی
آنکھیں مری سیلِ اشک برساتی ہیں!

جنگل کی یہ دلنشیں فضا۔ یہ برسات

یہ نغمۂ باراں، یہ ہوا، یہ برسات

ساماں وارفتگیِ شاعر کے ہیں

کوئل کی یہ کوک، یہ گھٹا، یہ برسات!



ہلکی سی پھوار اور کنارِ دریا

یا صُبحِ بہار اور کنارِ دریا

قسمت سے ملتے ہیں کسی کو محرومؔ

ساون، اشجار اور کنارِ دریا

کس درجہ غم آفریں ہے عالم دل کا
محروم اُمیدِ جاں ہوا غم دل کا
دل ماتمِ آرزو میں مضطر تھا کبھی
اب ہم ہیں اور آہ! ماتم دل کا



کب کوئی جہاں میں چھوٹتا ہے غم سے
دل آخرِ کار ٹوٹتا ہے غم سے
صدمات سے کھلتی ہیں بشر کی آنکھیں
چھوڑا غفلت کا چھُوٹتا ہے غم سے!

بے دل آفاتِ زندگانی سے ہوں

بیزار ترے لئے، جوانی سے ہوں

احساں اس میں ترا نہیں ہے اے موت

زندہ ہوں تو اپنی سخت جانی سے ہوں!



بے بیٹھے زندگی میں کیوں تیرا غم

کیا تلخئ زیست کو یہ کر دے گا کم!

تو بھی کرتی ہے کب کسی کی پروا

اے موت، اگر ہیں تجھ سے بے پروا ہم!

مدّت سے غمِ نہاں ہے غم خوار مرا
دل خنجرِ یاس سے ہے اَفگار مرا
اے بزمِ سخن! نہیں ہوں تیرے قابل
خود ذوقِ نوا سے دل ہے بیزار مرا!



درکار جگر تھا زخمِ کاری کے لئے
تیّار نہ تھا جگر فگاری کے لئے
محرم! خوش اس کو کس طرح میں لکھتا
جو عمر ملی تھی سوگواری کے لئے!

دنیا کتنی حسین نظر آتی تھی
رنگیں، حُسن آفریں نظر آتی تھی
اب یاس کی تیرگی ہے غالب ہر سُو
پہلے جو کہیں کہیں نظر آتی تھی!



ہر بیم و اُمید سے بچاتا ہوں اسے
اِنکار و نوید سے بچاتا ہوں اسے
دل زخمئ شمشیرِ حوادث ہے مرا
جذباتِ شدید سے بچاتا ہوں اسے!

غم باعثِ انتشار ہوتا ہے کبھی

سینہ غم سے فگار ہوتا ہے کبھی

یہ بھی سچ ہے کہ خاطرِ مضطر کو

حاصل غم سے قرار ہوتا ہے کبھی!



کیا کہیئے ہمیں کہاں کہاں کا غم ہے

جاں کاہ زمین و آسماں کا غم ہے

تسکینِ دنیا سے ہے نہ عقبیٰ کی اُمید

اک دِل ہے اور دو جہاں کا غم ہے!

ہر راہ میں تشویش ہے شامل تیری

جاں فرسا ہے مسافت اے دل تیری

آخر یہ تری ہرزہ شتابی کب تک

معلوم نہیں کہاں ہے منزل تیری!



اے دلِ ناکام تو رہے گا کب تک

غافل تہِ دام تو رہے گا کب تک

لے سانس کبھی ہوائے آزادی میں

دُنیا کا غلام تو رہے گا کب تک!

دُنیا میں ہُوئی تجھ کو نہ تسکین حاصل

کوسوں تجھ سے رہا سکونِ کامل

کیونکر ہو علاج تیری بے تابی کا

لے جاؤں تجھے کہاں میں اے دل! اے دل!!



کیا چیز تری ہے جس کو تُو کھوتا ہے

نُقصاں نُقصاں پُکار کر روتا ہے

اک ذرّہ بھی دہر میں نہیں جب تیرا

بے تابِ غمِ زیاں سے کیوں ہوتا ہے؟

لائے تھے ساتھ، کچھ نہ لے جائیں گے

ہمراہ عمل بُرے بھلے جائیں گے

جس کو اپنا سمجھ رہے ہیں، سب کچھ

رہ جائے گا، اور ہم چلے جائیں گے!



عالم جب محوِ خواب ہو جاتا ہے

ہنگامۂ ہست و بُود سو جاتا ہے

اکثر شبِ تار میں تصوّر میرا

افلاک کی وسعتوں میں کھو جاتا ہے!

ہم کہتے ہیں کاش، غیر فانی ہوتے
بہرہ اندوزِ کامرانی ہوتے
فانی ہوتے نہ ہم اگر اے دلِ زار
غم ہائے نہاں بھی جاودانی ہوتے!



دُنیا دیکھی بہ عالمِ بے خبری
سمجھے بہ غلط اسی کو ہم دیدہ وری
جمعیّتِ خاطرِ پریشاں کے لئے
آنکھوں نے مول لی پریشاں نظری!

حُسنِ خط و خال کا تماشائی تھا

تصویرِ جمال کا تماشائی تھا

دیکھا اب غور سے تو معلوم ہُوا

میں اپنے خیال کا تماشائی تھا!



بے کل موجوں کو مثلِ سیماب کیا[1]

دریاؤں کو منبعِ تب و تاب کیا

اپنے ہاتھوں سے اہلِ پنجاب نے خود

پنجاب کی آبرو کو غرقاب کیا!

[1] ۱۹۴۷ء کے فسادات پر

مجنوں رونق تھا دامنِ ہاموں کی
گردش اسے کر گئی فنا گردوں کی
شہروں کی طرف جو بڑھ رہا ہے صحرا[1]
پھر اس کو تلاش ہے کسی مجنوں کی!

[1] مشہور ہے کہ صحرائے راجستھان اپنی حدود کو توڑ کر دہلی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ (محروم)

فکر و نظر

الحاد کو کیوں کرے گوارا انساں
ہو قائلِ ذاتِ عالم آرا انساں
چارہ ہی نہیں ہے جب سہارے کے بغیر
ڈھونڈے کیوں "نیست" کا سہارا انساں!

قطرہ سمجھے حقیقتِ دریا کیا
ذرّے کو علمِ وسعتِ صحرا کیا
پایا نہ سُراغ ذاتِ بے پایاں کا
عقلِ انساں بھٹک رہی ہے کیا کیا!



رازِ ہستی بشر کو ہو کیا معلُوم
سرگرداں عقل ہے، نتیجا معلُوم
باوصفِ ہزار علم اس کو اپنا
آگا معلوم ہے نہ پیچھا معلوم!

کھلتا یہ راز علم و حکمت پہ نہیں
جب تک کرمِ خاص بصارت پہ نہیں
معلوم ہوا ہے بعدِ فکرِ بسیار
پردہ آنکھوں پہ ہے حقیقت پہ نہیں!



کانوں نے سُنی نہیں ہے آواز کہیں
آنکھوں نے بھی دیکھے نہیں انداز کہیں
دِل سے پیہم مگر ہے آتی یہ صدا
موجود ہے وُہ انجمنِ ناز کہیں!

معدُوم اُسے نہ جان جو ہے مستُور

ظلمت کے مقابلے میں موجود ہے نُور

اے مُنکرِ ذاتِ حق! ذرا کھول آنکھیں

فانی ہم ہیں تو کوئی باقی ہے ضرُور!



کیوں ظلمتِ وہم نے تجھے گھیرا ہے

کیوں عالم تاریک تری دُنیا ہے

کر اُس کے خیال سے دل اپنا روشن

خالق جو مہر و ماہ و انجم کا ہے!

کیوں جرأتِ الحاد کا اظہار کریں

ابلیس کو کس لئے نگوں سار کریں

توفیقِ رضائے حق سے عاری ہیں مگر

کیوں ہستیٔ ذاتِ حق سے انکار کریں



خالق نے بسا کے دہر کی بستی کو

مفہوم دئے بلندی و پستی کو

ہر ذرّے کے نقطے میں نہاں ہے نکتہ

مہمل نہ سمجھ نگارشِ ہستی کو!

خورشید و کواکبِ درخشندہ و ماہ

ہم اِن کے پرستار نہیں ہیں واللہ

یہ لائقِ احترام لیکن ہیں ضرور

ہیں قدرتِ صانعِ حقیقی پہ گواہ!



دل خوش نہ ہُوا مَلال پیوستہ رہا

بدحال رہا خَراب اور خستہ رہا

بے سُود ہوئیں اِدھر اُدھر کی باتیں

سربستہ جو راز تھا وہ سربستہ رہا!

عقل و خِرد و شعور و فہم و ادراک

اُڑ اُڑ کے گئے ہیں تا بہ اَوجِ افلاک

لیکن نہ ملا نشانِ منزل اِن کو

کچھ تُو ہی بتا دے اے جنُونِ بے باک!



رَزّاق سے سب ہیں رِزق پانے والے

مہماں اُس کے ہیں آنے جانے والے

نازاں نہ ہو اَور کو کھِلا کر اِنساں!

اِک خوانِ کرم سے سب ہیں کھانے والے!

تجھ کو پئے رزق اگر پریشانی ہے

اے دل! تیری یہ محض نادانی ہے

وہ دیکھ فلک پہ بادلوں کے انبار

سامانِ حیاتِ عالمِ فانی ہے!



جو راستہ رہبرِ ازل دکھلائے

عقل اُس پہ چلے تو ٹھوکریں کیوں کھائے

وہ عقل بچائے گی تمہیں کیا محترم!

جو واہمِ فریبِ نفس میں آجائے

بدخواہ نہیں خالقِ اکبر اپنا

غائب ہو کر بھی ہے وُہ رہبر اپنا

ہم خود ہیں بُرے تو ہے مقدّر بھی بُرا

اچھّے ہیں تو اچھّا ہے مقدّر اپنا!



کیوں سب کو سُنائیں حالِ ابتر اپنا

جب اس میں قصور ہو سراسر اپنا

ہم کوستے ہیں عبث مقدّر کو ندیمؔ!

اعمال سے بنتا ہے مقدّر اپنا

دروازہ نجات کا بیاباں میں نہیں
دل کا آرام قصر و ایواں میں نہیں
تسکیں جنّت میں بھی نہیں مل سکتی
جب تک موجود قلبِ انساں میں نہیں!



ہم بھول کو اپنی علم و فن سمجھے ہیں
غربت کے مقام کو وطن سمجھے ہیں
منزل پہ پہنچ کے چھاڑ دیں گے اس کو
یہ گردِ سفر ہے جس کو تن سمجھے ہیں!

ظاہر میں قضا بڑا ستم ڈھاتی ہے

جاں اُس کے تصوّر سے دہل جاتی ہے

لیکن ہر موت کا نتیجہ ہے حیات

ہر شام پیامِ صبحِ نَو لاتی ہے!



انجام خمار ہے ہر اِک مستی کا

عازم ہر اَوج ہے یہاں پستی کا

دُنیا میں نہ مطمئن نہ مضطر ہیں وہ

معلوم جنہیں مآل ہے ہستی کا

جو تارکِ اسبابِ جہاں ہوتا ہے

غم اُس کو دمِ مرگ کہاں ہوتا ہے

دُنیا مہماں سرائے ہے اُس کے لیئے

خود مثلِ مسافر گزُراں ہوتا ہے!



عشرت ہے پیشِ دیدۂ بینا کیا

ساقی و مغنّی و مے و مینا کیا

بزمِ ماتم میں ذوقِ مستی، افسوس!

اندوہِ فنا ہو جس میں وہ جینا کیا!

تلخابۂ غم کے چکھنے والے کم ہیں

اپنی جرأت پر کھنے والے کم ہیں

پھولوں کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہیں سب

کانٹوں پہ پاؤں رکھنے والے کم ہیں!



بر ہم دل و جاں کی شادمانی کیوں ہے؟

دونو میں نزاعِ درمیانی کیوں ہے؟

گر مضطرب ہوائے باقی ہے جاں

دل محوِ تعلّقاتِ فانی کیوں ہے؟

مہر و ماہ و زمین و اختر گرداں

ہیں رُوئے زمیں پہ چار عنصر گرداں

گردش سے ہے جب قیامِ بزمِ ہستی

کیا شکوہ، اگر ہے آدمی سر گرداں!



اللہ رے وسعتِ جہانِ انجم

گُم ہوتی ہے عقل درمیانِ انجم

کیا سامنے ان کے ہے زمیں کی ہستی

شاید ہے یہ گردِ کاروانِ انجم!

مایا کا طلسم ہے، جہاں کچھ بھی نہیں

آثارِ ثباتِ این و آں کچھ بھی نہیں

بے بود وجودِ عالمِ امکاں ہے

جو کچھ بھی ہے، جز وہم و گماں کچھ بھی نہیں



کیوں دارِ فنا کو جائے راحت سمجھا

اور ملکِ بقا کو دارِ آفت سمجھا

محروم! سمجھ ہی کچھ تری ہے الٹی

غربت کو وطن، وطن کو غربت سمجھا!

کب دردِ حیات کی دوا ملتی ہے
ہاں تلخیٔ جرعۂ فنا ملتی ہے
جینا شاید ہے جرمِ سنگین جہاں پہ
ہر شخص کو موت کی سزا ملتی ہے



پاداشِ عمل کی ہے یہ منزل اے دوست!
قدرت کا ہے انتظام کامل اے دوست!
اعمالِ بد اپنے بھول جاتے ہیں ہم
قدرت ان سے نہیں ہے غافل اے دوست!

دنیا میں برائے مردمِ کم مقدار

اہلِ شوکت ہیں باعثِ صد آزار

راہوں میں رہروانِ منزل کے لئے

اڑتی ہوئی گرد چھوڑ جاتے ہیں سوار!



فطرت عیبِ نہاں اگر رکھتی ہے

رفعت ظاہر کیا اثر رکھتی ہے

پرّاں اوجِ فضا پہ ہوتی ہے چیل

نیچے مردار پر نظر رکھتی ہے!

یہ جسم ہے خاک کے برابر اے دل

پنہاں اس میں ہے ایک گوہر اے دل

تو اُس کی تلاش میں رہا گر ناکام

جائے گا عدم کو خاک بر سر اے دل!



رُتبوں میں یہاں راحت و آرام نہیں

معزول کہیں گردشِ ایّام نہیں

کس اَوج پہ اُڑتے ہیں یہ بادل محرُوم

رونے کے سوا اِن کو کوئی کام نہیں!

نقشِ باطل حروفِ تقدیر نہیں

مٹ جائے مٹانے سے، وہ تحریر نہیں

تقدیر بدلتی ہے عمل سے جس کے

وہ حُسنِ عمل ہے، سحرِ تدبیر نہیں!



تدبیر کے بندوں نے بڑے کام کئے

تقدیر نے جب نہ دی اجازت، نہ جیئے

تدبیر سے لے کر پرِ پرواز اُڑے

تقدیر نے پَر دار کے پَر توڑ دیئے!

تنکا ہے بشر موجِ فنا کے آگے
چلتی نہیں کچھ اس کی قضا کے آگے
کیا چیز ہے موت، آ بتاؤں تجھ کو
انساں کی شکست ہے خدا کے آگے!



کتنی ہی احتیاط کوئی کر جائے
چھلکے گا جامِ زندگی جب بھر جائے
جینا ہو تو بے اثر ہو افعی کا زہر
مرنا ہو تو زنبور کا کاٹا مر جائے!

مختار تھا، کر گیا جو دل کو بھایا

ہو کر مجبور پھر بھی اس کا پایا

یوں جبر سے اختیار مغلوب ہوا

یوں عالمِ اختیار میں جبر آیا!



ہمدم، ہمراز نفسِ عیّار مِلا

دل عشوۂ دہر کا طلبگار مِلا

تھا رہبرِ عقل پر بھروسا ہم کو

افسوس کہ رہبر بھی خطا کار مِلا!

دم اکثر پارسائی کا بھرتا ہے

حیراں ہوں کہ دل مرا یہ کیا کرتا ہے
خوف اس کو گُناہ سے نہیں ہے لیکن
الزامِ گُناہ سے بہت ڈرتا ہے!



اِنکارِ گُناہ بھی کیے جاتا ہوں
تکرارِ گُناہ بھی کیے جاتا ہوں
حاصل ہو ثوابِ مُفت اس لالچ میں
اقرارِ گُناہ بھی کیے جاتا ہوں!

دل کی خواہش یہ ہے کہ بن جاؤں نیک
نیکی کروں اور اس کا صلہ پاؤں نیک
تحریک مگر نفس کی ہر لحظہ ہے یوں
نیکی سے کروں گریز، کہلاؤں نیک!



ساقی ہے یہاں، نہ مے نہ مستی نہ سرور
نغمہ ہے نہ حسن و عشق کا ہے مذکور
ملزم اس میں نہ مجھ کو ٹھہرا اے دل
میری چشمِ مآل بیں کا ہے قصور!

ہر چند وہ بے نیاز کہلاتا ہے

مخلوق پہ اپنی رحم فرماتا ہے

دل خوف سے اس کے کانپ اُٹھتا ہے مرا

انساں جب بے زباں کو تڑپاتا ہے



ذات اُس کی قیاس وہم سے باہر ہے

جرأت سے اور سہم سے باہر ہے

ہے اُس کی تلاش میں خرد سرگرداں

دل میں رہ کر جو فہم سے باہر ہے!

اس دارِ فنا میں طالبِ راحت ہوں

مستِ مئے خواب اور غفلت ہوں

میکش اچھا ہے مجھ سے مسرور تو ہے

میں مرتکبِ گناہِ بے لذّت ہوں!



کہتے ہو کشش گناہ میں کیوں آئی

ترغیب ہماری راہ میں کیوں آئی

لیکن جو چیز رہزنِ ایماں تھی

ہر پھر کے وہی نگاہ میں کیوں آئی

سوال

ہر چند بُری میں نے رَوِش رکھّی ہے
فطرت پہ نگاہِ بے خلش رکھّی ہے
گر بے اَدَبی نہ ہو تو اتنا پوچھوں
کیوں تو نے گناہ میں کشش رکھّی ہے

جواب

وہ چیز گُناہ میں کہاں ہے محرُوم!
دل جس کے لئے تڑپتا ہے محرُوم!
لذّات میں ہے جو دل فریبی کم و بیش
تیری نیّت کا امتحاں ہے محرُوم!

ہر چند گُناہ میں کشش ہے موجود
لیکن ساتھ اس کے سرزنش ہے موجود
ہر نوش میں نیش کا خطر ہے پنہاں
ہر پھول میں خار کی خلش ہے موجود!



دنیا میں کثافتِ ہوا کے ساماں
بے حد ہیں، بے شمار ہیں، بے پایاں
ہو جاتی ہے پاک پھر بہ لُطفِ یزداں
مایوس نہ ہو گناہ کر کے انساں!

کہتے ہیں نجات اگر ہے تجھ کو مرغوب

کر نفسِ زیاں کار کو پہلے مغلوب

گر نفس پہ حاصل مجھے قدرت ہو جائے

کس چیز سے پھر نجات ہو گی مطلوب؟



مشکل ہے نجاتِ روح جب تک انساں

آغوشِ فریبِ نفس میں ہے شاداں

آغوشِ فریبِ نفس وہ دوزخ ہے

ہوتا ہے بشر کو جس پہ جنت کا گماں!

آرام بھی ہے جہاں میں، آزار بھی ہے
ہے امن و اماں بھی اور پیکار بھی ہے
راحت کے ساتھ رنج بھی ہے موجود
سچ ہے کہ جہاں گُل ہے وہاں خار بھی ہے!



دل عالمِ رنگ و بو سے بیزار بھی ہے
باقی ہوس و ہوائے گُلزار بھی ہے
لیکن اس میں قصور کیا ہے دل کا
دل کش بھی ہے یہ جہاں دل آزار بھی ہے!

ادبار کا گھر کہ جائے اقبال ہے دہر

جیسا نظر آتا ہے بہر حال ہے دہر

کیوں زشتیٔ دہر پہ ہے برہم اِتنا

ناداں! ترا آئینۂ اعمال ہے دہر!



تاخیرِ مزید یاس سے اچھّی ہے

ہر گفت و شنید یاس سے اچھّی ہے

ہر چند فریبِ محض ہے، دھوکا ہے

پھر بھی اُمّید یاس سے اچھّی ہے!

اس سے تو دل و دماغ ہوں گے ابتر

ہاتھ آئے گا کیا بہت کتابیں پڑھ کر

آنکھیں روشن ہوں اور دل نورانی

ڈال ایک نظر صحیفۂ فطرت پر!



اُڑ جائے گا رنگِ حسنِ رنگیں اے دل!

دولت بھی نہیں ثبات آئیں اے دل!

جب تک ہے فنا پذیر چیزوں سے لگاؤ

حاصل ہو گی نہ تجھ کو تسکیں اے دل!

اُلجھی اُلجھی شباب کی باتیں ہیں

مبہم، پیچیدہ، خواب کی باتیں ہیں

چھوڑو بھی خیالِ زلفِ خُوباں چھوڑو

محرم یہ پیچ و تاب کی باتیں ہیں!



آٹا مصنوعی اور گھی مصنوعی

مل جاتے ہیں دودھ اور دہی مصنوعی

مصنوعی ہیں زندگی کے سارے ساماں

کیوں کر نہ ہو اپنی زندگی مصنوعی!

ہر ایک ادا ہے حُسن کی مصنوعی
مصنوعی عتاب اور ہنسی مصنوعی
مصنوعی دوائیں جب مسیحا بیچیں
کیوں کر نہ ہو دردِ عاشقی مصنوعی!



ہر چیز اگرچہ اب ہوئی مصنوعی
تو اپنی بنا نہ زندگی مصنوعی
صنعت کو فروغ کب ہُوا قدرت پر
اُڑ اُڑ کے گرے گی یہ پری مصنوعی!

کِس کام کی ہے شگفتگی مصنوعی
رونے کا مقام ہے ہنسی مصنوعی
دل کو حاصل ہو کیا تصنّع سے فراغ
کِھلتی دیکھی نہیں کلی مصنوعی!



اس دَورِ کمالات میں پسپا ہوں میں
نقشِ قَدَمِ قدیم کا جویا ہوں میں
سائنس کی تم ترقّیاں گنواؤ
انساں کی مصیبتوں کو گنتا ہوں میں!

لاہور میں لوگ آرٹ فرماتے ہیں

دوشیزہ کو رقصِ ناز سکھلاتے ہیں

یہ آرٹ وہ ہے کہ جس پہ شرم اور حیا

غیرت سے زمین میں گڑے جاتے ہیں!



جو آرٹ کے سرپرست کہلاتے ہیں

ناموسِ وطن پہ کیوں غضب ڈھاتے ہیں

ہے کون رذیل ان کو گر کہیے شریف

مشغول ہیں جو لڑکیوں کو نچواتے ہیں!

دوشیزہ سرِ بزم اگر ناچے گی

بگِرد اس کے ہوس کا منظر ناچے گی

کھا جائے گی لغزش نگہِ پاک وہیں

جس وقت وہ لچکا کے کمر ناچے گی!



پُتلی بے شک بنے ہُنر کی لڑکی

لیکن نہ ہو جنسِ رہگذر کی لڑکی

گھر گھاٹ کہاں رہا شرافت کے لیئے

جب ناچتی ہو شریف گھر کی لڑکی!

کہلاتی تھی پہلے وہی اچھی لڑکی

شرم اور حیا کی ہو جو پتلی لڑکی

افسوس کہ انقلابِ دوراں سے آج

ممتاز ہے رقص کرنے والی لڑکی!



اربابِ خرد نے بات یہ مانی ہے

غارت گرِ ہوشِ حُسنِ نسوانی ہے

کیا گزرے گی تجھ پہ جب ہو وہ مائلِ رقص

صورت جس کی سکوں میں طوفانی ہے!

رعنائی کو جو لباس نہاں کر دے

بے شک اسے عاشق کا گریباں کر دے[1]

ملبوس وہی پسندِ خاطر ہے آج

ہر عضو کو جو اور نمایاں کر دے !



حیران ہوں میں حُسن کی عُریانی پر

ہنستا ہے حُسن میری حیرانی پر

اس دَور میں شکوہ بے حجابی کا ہے

مجبُوب بہت ہوں اپنی نادانی پر !

[1] عاشق کا گریباں کر دے - چاک کر دے - پھاڑ ڈال

عریانیٔ حُسن پہ نہ حیراں ہونا
منظور ہے گر تم کو سخنداں ہونا
شک اس میں نہیں ہے کہ بہ تغیرِ حرُوف
ثابت[1] رعنائی کا ہے عُریاں ہونا!



زاری ہے اگر بُلبلِ نالاں کا قصُور
ہے خندۂ بے جا گُلِ خنداں کا قصور
کیوں میری نگاہ پر ہے سارا الزام
کچھ بھی نہیں حسنِ نیم عُریاں کا قصور؟

[1] رعنائی کے حروف کے ادل بدل سے لفظ عریاں بن جاتا ہے۔ (محروم)

زوروں پہ ہے انقلاب حد سے بڑھ کر
حالات ہوئے خراب حد سے بڑھ کر
کیوں عشق حدوں میں اپنی محدود رہے
جب حسن ہو بے حجاب حد سے بڑھ کر !



یہ ملک تھا پاک آتماؤں کا وطن
یا دیویوں اور دیوتاؤں کا وطن
مغرب کی پیروی سے رفتہ رفتہ
بنتا گیا خوبرو بلاؤں کا وطن !

وُہ لائقِ احترام و برتر اُستاد

اس دَور میں ہو گیا محقّر اُستاد

اے وائے یہ انقلابِ عبرت انگیز

پہلے ہادی تھا۔ اب ہے نوکر اُستاد!



واللہ کہ ہے عجیب شَے آزادی

طاقت کی مگر کنیز ہے آزادی

بن جاتی ہے زہر ناتواں کے حق میں

ازبسکہ ہے تیز و تُندشَے آزادی!

ہے دشمنِ پردہ دہر کی نیرنگی

کیوں اہلِ ادب میں ہے یہ خانہ جنگی

سوسائٹی آمادۂ عُریانی ہے

کیا شکوہ جو تصویر بھی اُترے ننگی !



تہذیب کی بے پردہ ادا سے نہ لڑو

تخریب کی پروردہ بَلا سے نہ لڑو

دیوانہ کہیں گے اِس زمانے کے لوگ

محترم زمانے کی ہوا سے نہ لڑو

تغیّر پسند ہے زمانے کا مزاج
تبدیل ہوئے جاتے ہیں سب رسم و رواج
پہلے تھا جنونِ عشق عریانی کوش
برہم زنِ ہوشِ حُسنِ عریاں ہے آج



دورِ حاضر میں حُسن کا یہ منظر
برقِ خاطف ہے خرمنِ غیرت پر
مثلِ رازِ قدیم مستور حیا
عشوۂ ادبِ جدید سے عُریاں تر!

عظمتِ رام

کیا سالکِ با صفا تھے شری رام ہوئے
مشہورِ جہاں خدا شری رام ہوئے
حیرت ہے کہ وہ ذلیل ہو دُنیا میں
جس قوم کے پیشوا شری رام ہوئے!

شاہد سے کبھی نہ جام سے پاتا ہے
تسکینِ دل رام نام سے پاتا ہے
کرتا نہیں رام سوئے خیالِ باطل
آرام جو قربِ رام سے پاتا ہے!



کہنے کو تو رام کے پجاری ہیں ہم
دعویٰ ہے کہ محوِ حق شعاری ہیں ہم
محبوبِ جہاں ہوا جن اوصاف سے رام
افسوس اُن اوصاف سے عاری ہیں ہم!

اوتار صداقت اور حق کا تھا رام

راون باطل کا پیکرِ بد انجام

اے پیروِ رام، راہِ حق کو مت چھوڑ

راون کی طرح مٹے گا باطل کا غلام!



اے قومِ زوال دیدہ، اُٹھ اب بھی سنبھل

چل سوئے عروج، قعرِ پستی سے نکل

روشن ہے اور صاف تیرا رستہ

ہیں رام کے نقشِ پا درخشندہ کنول!

پیری

طفلی تھی وقفِ نازونعمت کے لیئے

تھا عہدِ شباب خوابِ غفلت کے لیئے

پیری ہوئی نذرِ ضعفِ پیری، افسوس!

رکھا تھا جسے میں نے ریاضت کے لئے!

حیران ہوں، کیا کیا خدایا میں نے

بے فائدہ عمر کو گنوایا میں نے

پیری بھی قریب خاتمہ آ پہنچی

منزل کا نشاں ابھی نہ پایا ہم نے!



اُٹھتی ہی نہیں نظر، جُھکی جاتی ہے

نادم ہے، خاک پر جُھکی جاتی ہے

سر پر ہے عمر بھر کا بارِ عصیاں

پیری میں جو یُوں کمر جُھکی جاتی ہے!

دل سے اب تک شباب کی باتیں ہیں
یعنی وہی اضطراب کی باتیں ہیں
مذکورِ غمِ عشق پس از عہدِ شباب
صبحِ پیری میں خواب کی باتیں ہیں!



لب پر اکثر ثواب کی باتیں ہیں
فکرِ روزِ حساب کی باتیں ہیں
لیکن دل میں بغور دیکھا تو وہاں
اب تک لطفِ شباب کی باتیں ہیں!

طالب دلِ زار شادمانی کا ہے

مقصد کچھ اور زندگانی کا ہے!

غفلت میں بسر ہوئی جوانی ساری

ماتم پھر بھی اُسی جوانی کا ہے



پیری میں جُنونِ ذوقِ خواری نہ رہا

سودائے نشاطِ میگساری نہ رہا

بالوں پر آگئی سفیدی یکسر

یعنی دَورِ سیاہ کاری نہ رہا!

شوقِ رُسوا نہ ہے جوانی باقی
کم تر ہے نشاطِ زندگانی باقی
یہ قصّہ بھی اب تمام ہونے کو ہے
تھوڑی سی ہے اورعُمرِ فانی باقی!



افسردہ شباب کا جُنوں ہوتا ہے
دل پر اک ماتمی سکُوں ہوتا ہے
محرومؔ اس انقلاب پر کیا حیرت
پیری آتی ہے جب تو یُوں ہوتا ہے!

راحت سے غرض ہے اس کو، آرام سے کام
رکھتا نہیں اندیشۂ انجام سے کام
بیکار گزر گئی جوانی ساری
کچھ بھی نہ بن آیا دلِ ناکام سے کام!



طفلی سے شباب سے گزر آئے ہیں
سیرِ چمنِ حیات کر آئے ہیں
آتا ہے یہ ویرانۂ پیری میں نظر
صیّادِ اجل کی شست پر آئے ہیں!

روشن نہ دیکھنے کی جب تھی صورت
انجامِ شباب کی نہ دیکھی صورت
پیری میں بصارت کی کمی کے باوصف
آتی ہے نظر صاف اجل کی صورت!



جب تک تھے ہم انجان، خوشی کے دن تھے
حسرت تھی نہ ارمان، خوشی کے دن تھے
بچپن کے ساتھ ہو گئے وہ رخصت
دو روز کے مہمان خوشی کے دن تھے!

کِس سمت کو اے عُمرِ رواں جائے گی
کیا دہر سے ہو کے بے نشاں جائے گی؟
کہتے رہے تجھ سے ہم کہ جلدی نہ گزر
گُزری ہے تو اب بتا کہاں جائے گی؟



کچھ منزلِ زیست کا سفر باقی ہے
ساتھ اس کے تغافُل بھی مگر باقی ہے
گُزری شبِ غفلتِ جوانی لیکن
آنکھوں میں نیند کا اثر باقی ہے!

ہر صورتِ حال کا تماشائی ہوں

شاہوں کے مآل کا تماشائی ہوں

احوالِ جہاں بچشمِ عبرت دیکھا

اب اپنے زوال کا تماشائی ہوں!



محرومؔ، یہی ہے عمرِ فانی کا نظام

پیری دیتی ہے سب کو عزلت کا پیام[1]

پیرانِ کہن سال کی محفل میں چلو

کالج کو وداع، نوجوانوں کو سلام!

[1] عمر کی بنا پر پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ملازمت سے سبکدوشی کا نوٹس ملنے پر (محرومؔ)

اے عمرِ رواں طلسم ٹوٹا تیرا
سامانِ بقا اجل نے لوٹا تیرا
لے، ہم بھی چلے ہیں تجھ سے رخصت ہو کر
منزل کے قریب ساتھ چھوٹا تیرا !

شعر و شاعری

شاعر ہوں، شاعری میں اُستاد نہیں
گو نقدِ سخن ہے پاس، نقّاد نہیں
سودا کب سے ہے شاعری کا مجھ کو
مُدّت اِتنی ہوئی کہ کچھ یاد نہیں!

ممتاز بہت عوام سے ہے شاعر

پائندہ خود اپنے نام سے ہے شاعر

خضر و آبِ بقا کا محتاج نہیں

زندہ اپنے کلام سے ہے شاعر!



انجامِ حیات جو پسِ پردہ ہے

معلوم نہیں بُرا ہے، یا اچھّا ہے

کی عُمر تمام شاعری میں ہم نے

باتوں باتوں میں یہ سفر کاٹا ہے!

محشر جہاں لے کے قضا جائے گی

واں شاعری و اعری نہ کام آئے گی

پیری ہے فکرِ عاقبت کر ناداں!

کیا فکرِ سخن نجات دلوائے گی؟



موزوں ہم نے کئے ہیں اشعار بہت

ضائع کر دی ہے عمر بیکار بہت

اب فکرِ سخن کہاں، جوانی نہ رہی

پیری کے لئے اور ہیں افکار بہت!

ہے شعر و سخن کو فکرِ رنگیں درکار

یہ پھول کھلاتی ہے جوانی کی بہار

دامانِ خزاں میں گُلِ خوش رنگ کہاں

پیری میں کہاں سے لائیں رنگیں اشعار؟



پائندہ حقائق کو بزورِ تخئیل

جذبات میں کرتا ہے سخنور تحلیل

پھر قالبِ موزوں میں ہیں ڈھلتے جذبات

یوں ہوتی ہے نظمِ دلنشیں کی تشکیل!

گو حُسنِ عمل کا ترجماں ہے شاعر
میدانِ عمل میں بے کراں ہے شاعر
فقدانِ عمل کا اس کو الزام نہ دو
دستِ عامل نہیں، زباں ہے شاعر!



سنگِ خارا کی رگ سے پانی کی اُمید
ساحل سے موج کی روانی کی اُمید
رکھنا بے شک، مگر نہ رکھنا ہرگز
جاہل سے سخن کی قدردانی کی اُمید!

مُدّت سے غمِ نہاں ہے غمخوار مرا
دل خنجرِ یاس سے ہے افگار مرا
اے بزمِ سخن! نہیں ہوں تیرے قابل
اب ذوقِ نوا سے دل ہے بیزار مرا!

نصائح

واعظ نہ سہی سخنورِ نکتہ سرا
ناصح سے بھی راستہ سہی اُس کا جُدا
یہ بھی تو ہے بے جا کہ وہ ناشر بن جائے
رندی و سیاہ کاری و مستی کا!

اعمال کا اپنے ہو محاسِب انساں
نفسِ امّارہ پر ہو غالب انساں
ہو دشمنِ رحم خود تو پھر کس مُنہ سے
اللہ سے رحم کا ہو طالب انساں!



بہبُودِ معاد کی کوئی بات کریں
تا وقتِ وداعِ جاں نہ ہیہات کریں
خدشہ ہے نفسِ دوں کا لیکن کب تک؟
جب تک خود اس کی ہم مدارات کریں!

کیا تجھ کو؛ جو کوئی ہے بد اعمال اے دوست!

کر اس کے حساب کی نہ پڑتال اے دوست!

مائل جو کسی کی عیب جوئی پہ ہو دل

مُنہ اپنے گریباں میں وہیں ڈال اے دوست!



رکھّیں انصاف کو عزیزِ جاں ہم

لائیں نہ زباں پہ شکوۂ دوراں ہم

اوروں سے ہیں جس سلوک کے خواہاں ہم

اوروں سے وہی کریں تو ہیں انساں ہم!

لازم ہے بشر کو خاکساری کا چلن

تن تن کے نہ چل کہ آخرِ کار یہ تن

ہر چند ہو پروردۂ انواعِ نِعَم

ہو جائے گا لقمۂ دہانِ مدفن !



یہ گوشت کا اَور پوست کا پیراہن

صد حیف کہ ہو کبر و منی کا مَسکن

نُورِ دانش سے جن کے دل ہیں روشن

وُہ اس کو سمجھتے ہیں چِتا کا ایندھن !

آئینۂ دل کو گردِ کیں سے رکھ صاف

کر دے اہلِ ریا کے کینوں کو معاف

دُنیا میں نہ کر کسی سے بے انصافی

دُنیا سے مگر نہ رکھ اُمیدِ انصاف!



فطرت کی دی ہوئی مُسرّت کھو کر

اوروں کو نہ کر ملُول غمگیں ہو کر

یہ عُمر بہر حال گزر جائے گی

ہنس ہنس کے اسے گزار یا رو رو کر!

مضطر نہ مصیبتوں میں ہرگز ہو بشر
بڑھ جاتا ہے اس سے اور کُلفت کا اثر
تڑپے گر دام میں بہت مُرغِ اسیر
اُلجھن پیش آئے گی اُسے اُلجھن پر!



راحت آزارِ تن ہے محنت کے بغیر
تن رُوح پہ بار ہے طہارت کے بغیر
تسکیں نہیں رُوح کی عبادت کے بغیر
اک وہم عبادت ہے ریاضت کے بغیر!

ہوتا ہے رہینِ رنج۔ راحت کا غلام

مُفلس دل کا ہے۔ مال و دولت کا غلام

ہے یوں تو بُری ہر اک غلامی، لیکن

ہے سب سے بُرا خراب عادت کا غلام!



عُجب و مستی کا جن پہ طاری ہے خواب

وہ صحبتِ باہمی سے ہوتے ہیں خراب

یہ نکتہ مِلا ہے میکشوں سے ہم کو

باہم ناساز ہیں ہوا اور شراب!

تسکیں ممکن نہیں قناعت کے بغیر
پھر بھی مشکل ہے زیست دولت کے بغیر
محنت سے جو ہاتھ آئے دولت ہے وہی
ہے مالِ حرام، اگر ہے محنت کے بغیر!



رسم و راہِ کرم سے غافل نہ رہے
آہِ دلِ پُر الم سے غافل نہ رہے
احساسِ غم اس لئے ملا ہے اس کو
انساں انساں کے غم سے غافل نہ رہے!

بے جا نہیں گر نگاہ صحت پر ہے

دانا ہر گز نہیں جو تن پر و ہے

جاں شعلۂ لازوال ہے، پال اِس کو

تن آخرِ کار مشتِ خاکِ ستر ہے!



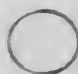
دُنیا میں ہے اک بلائے بد غیبت بھی

پیدا جھگڑے بھی کرتی ہے، نفرت بھی

غیبت کو بنا لیا ہے جس نے ہمدم

بزدل انساں ہے اور بد نیّت بھی!

شہرت طلبی ہے ایک سودائے خام
رہتا ہے اس سے آدمی بے آرام
آغاز، مخالفت کی صف آرائی
آخر، بے اعتنائی اس کا انجام!



گستاخ سے کس لئے بگڑتا ہے تو
کیا تیرا بگاڑ لے گا کوئی بد خو
بدتر ہے خوشامدی، اسے منہ نہ لگا
ہے اپنے ضمیر کا بھی، تیرا بھی عدو!

کہنے لگے اک دوست کہ میکش ہے فلاں

کیوں آپ اُسے کہتے ہیں اچھا انساں

یُوں میں نے کہا۔ مَے بھی کسوٹی ہے ایک

پہچان ہے نیک و بد کی جس سے آساں!



نفرت زندی سے گو تجھے ہے محرُوم

میکش ہیں کئی تجھ سے زیادہ معصُوم

گُزری ہے عمر مدرسے میں تیری

مے خانہ کے اسرار تجھے کیا معلُوم!

محفوظ رہے دل جو ہو قابو میں نظر

پھر کوئی ہو دِلستاں نہ کوئی دلبر

دیکھا ہے کہ آتی ہے تباہی اکثر

آنکھوں کی راہ سے دلِ انساں پر!



اس بزم میں روئے ہیں بہت ہنس ہنس کر

غفلت کی ہنسی نہ اس قدر ہنس، بس کر

دیکھ اُن کے کھنڈر بچشمِ عبرت، غافل!

اُجڑی ہیں جو بستیاں یہاں بس بس کر!

یادِ رفتگاں

یُوں شام و سحر ہُوئے جاتے ہیں

ایّام یُونہی بسر ہُوئے جاتے ہیں

جب سے ہُوئے دُور ہم سے مرنے والے

ہم اُن سے قریب تر ہُوئے جاتے ہیں!

بیادگارِ اقبالؔ

اقبالؔ کی موت پر بپا ماتم ہے
اے اہلِ وطن! بہت بڑا ماتم ہے
نغموں سے کہو کہ آج نالے بن جائیں
رضوانِ ریاضِ سخن کا ماتم ہے!

تھی باعثِ نازشِ وطن ذات تری

وُہ ذات تھی مجمعِ کمالات تری

ہر بات تری تھی بہرِ تزئینِ عمل

اقبالِ سخن طراز! کیا بات تری!



اُونچا سب سے کہیں ترا مسلک تھا

اَوجِ اہلِ یقیں ترا مسلک تھا

آتی ہے صدا بانگِ درا سے پیہم

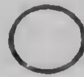
حُبِّ وطن اوّلیں ترا مَسلک تھا!

روشن کیا خوب نامِ مشرق تُو نے

کردی پُر نور شامِ مشرق تُو نے

اے شاعرِ ہمہ‌یال! صدیوں کے بعد

مغرب کو دیا پیامِ مشرق تُو نے!



اِیقان کو پستی سے نکالا تُو نے

اور اس کو دیا مقامِ بالا تُو نے

کرتے ہیں ہم وطن کی جس میں پُوجا

تعمیر کیا ہے وُہ شوالا تُو نے!

کم تر ہے حکیمِ ہند اگر تجھ کو کہوں
یا لعلِ کلیمِ ہند اگر تجھ کو کہوں
اللہ سے ہم سخن ہُوا توُ اکثر
زیبا ہے کلیمِ ہند اگر تجھ کو کہوں!

منشی مہاراج بہادر برق دہلوی

وہ طبعِ رواں، وہ خوش بیانی تیری
وہ نکتہ رسی، وہ نکتہ دانی تیری
اے برق ترا شباب میں مر جانا
تھی چشمکِ برق زندگانی تیری!

بَرقِ مرحوم کی جو یاد آتی ہے

محترم! دلِ زار کو تڑپاتی ہے

وہ طبعِ شگفتہ اور خنداں چتون

بجلی سی خیال میں چمک جاتی ہے!



اے برقِ نظر فروز تجھ کو کھو کر

احباب ترے بیٹھے ہیں بے بس ہو کر

کیا یاد ہماری بھی کبھی آتی ہے

کرتے ہیں یاد تجھ کو ہم رو رو کر!

منشی پریم چند

پائی تھی ادب کی جو سعادت تُو نے
کی اس سے وطن کی خوب خدمت تُو نے
کیا ہم سے ہو پریم چند تیری توصیف
افسانے کو کر دیا حقیقت تُو نے!

آہ! شیخ عبدالقادر

لاہور سے کیا بُری خبر آئی ہے
دنیا تاریک پھر نظر آئی ہے
رخصت ہوئے آہ! شیخ عبدالقادر
دِل ٹوٹ گیا ہے آنکھ بھر آئی ہے!

تھا علم و ادب کی رَوشنی کا مینار
پھیلائے تھے دُور دُور جس نے انوار
اندھیر ہے کس قدر کہ اے دستِ فنا
بیداد سے تیری ہو گیا وہ مسمار!



افسوس کہ اُردو کا نگہباں نہ رہا
شاعر گر و نقّاد و سخنداں نہ رہا
بے قدر ہوئی انجمنِ علم و ادب
یعنی ادب آموزِ ادیباں نہ رہا

تعمیرِ ادب کہ خدمتِ انساں بھی
آغازِ شباب سے عزیزِ جاں بھی
نایاب ہیں آج اس روش کے انساں
انسانیت اس کی ذات پر نازاں بھی !



یکساں دلِ این و آں کا وہ پیارا شیخ
تہذیبِ کہن کا پیکرِ زیبا شیخ
تھا کوئی اگر تو تھا وہ عبدالقادر
شاعر مدّاحِ جس کے ہوں، ایسا شیخ

بھگت سنگھ کی یاد میں

زنداں میں شہیدوں کا وہ سردار آیا

شیدائے وطن، پیکرِ ایثار آیا

ہے دار و رسن کی سرفرازی کا دِن

سردار بھگت سنگھ سرِ دار آیا!

تا دار و رسن شوق سے اِٹھلا کے گیا
تُو شانِ شہادت اپنی دِکھلا کے گیا
ٹُکڑے ہوتا ہے دل ترے ماتم میں
لاشے کا انگ انگ کٹوا کے گیا!



پی کر مئے شوق جھُومنا وہ تیرا
بے پروا یا نہ گھُومنا وُہ تیرا
ہے نقش ترے اہلِ وطن کے دل پر
پھانسی کی رَسن کو چُومنا وُہ تیرا!

جامِ حُبِّ وطن کے اے متوالے!

اے پیکرِ ناموس، حمیّت والے!

ہو عالمِ آرواح میں شاداں، کہ نہیں

اب تیرے وطن میں وہ حکومت والے!

صفی لکھنوی کی یاد میں

فخرِ شعرائے لکھنوی یاد آیا
وہ شاعرِ دردِ زندگی یاد آیا
اشعار دلوں سے آہ بن کر نکلے
اربابِ سخن کو جب صفی یاد آیا

دہلی میں ایک بار یومِ صفی منایا گیا۔ اس تقریب پر یہ رباعی موزوں ہوئی (مرتب)

آغا شاعر دہلوی

انوارِ ازل کا ہو جو شیدا شاعر
اک معنئ روشن ہے سراپا شاعر
ایسے ہی شاعروں میں ہے نام اُن کا
دہلی میں ہوئے ہیں وہ جو آغا شاعر!

نظم اور غزل میں ہو جو یکتا شاعر
پیدا ہوتا ہے کوئی ایسا شاعر
قادر تھے نظم اور غزل دونوں پر
دہلی کے شاعروں میں آغا شاعر



بعد اُن کے ہوئے بہت سے پیدا شاعر
لیکن نکلا نہ کوئی اُن سا شاعر
دہلی میں یاد آئے ہم کو اکثر
فخرِ دہلی جنابِ آغا شاعر

بروفاتِ شری دیش بندھو گپتا

کیا عالمِ ابتلا ہے دہلی میں آج
اک محشرِ غم بپا ہے دہلی میں آج
تڑپا گئی سب کو دیش بندھو کی موت
ہر ذرّہ تڑپ رہا ہے دہلی میں آج

آمادہ رہا وطن کی خدمت کے لئے
دولت کے لئے جیا، نہ شہرت کے لئے
بے وقت وفات دیشبندھو کی ہے
اِک حادثۂ عظیم ملّت کے لئے



خدمت سے وطن کی تو جو مخدوم ہُوا
رُتبہ تیرا وطن کو معلوم ہُوا
ڈیرا ہے دلِ اہلِ وطن میں تیرا
چشمِ ظاہر میں گرچہ معدوم ہُوا

ماتم کی صدا اُٹھا کرے گی برسوں
ہو گی غمناک تیری برسی برسوں
دہلی کے رہنمائے محبوب! تجھے
رو رو کے کرے گی یاد دہلی برسوں



ہے یوں تو قضا سے کوئی چارہ نہ مفر
اِس بات سے بھی نہیں ہے اِنکار مگر
مرتے ہیں تو ویراں نظر آتا ہے جہاں
ہمدردِ بشر کے دلِ شیدا بند ہوئے لبِ بشر

انتقالِ حضرت سیمابؔ اکبر آبادی

قصرِ شعر و سخن کا معمار گیا

افسوس کہ سیمابؔ سا فن کار گیا

بزمِ علم و ادب میں ماتم ہے بپا

بزمِ علم و ادب کا سردار گیا!

تاراجِ خزاں ہوا گلستانِ ادب
روتے ہیں آج قدردانانِ ادب
معلوم نہیں کہ اب رہے یا نہ رہے
سیماب کے دم قدم سے تھی شانِ ادب



اے شاہدِ شعر! تجھ پہ ہیں گرچہ نثار
اس دور کے شاعرانِ شیریں گفتار
اس بات سے تجھ کو بھی نہ ہوگا انکار
سیماب کے فکر نے دیا تجھ کو وقار!

واقعات و تقریبات

حسرتؔ موہانی اور قیدِ فرنگ

اے زندہ شہید، حسرتِؔ موہانی
سرکار نے کر دیا تجھے زندانی
لیکن اہلِ وطن کی نظروں میں تو
محبوب ہے مثلِ یوسفِ کنعانی

کتنی تری طبعِ نکتہ رس رنگیں ہے
رنگینیٔ طبع سے نفس رنگیں ہے
بلبل تو ہے وہ گلشنِ معنی کا
نغموں سے ترے ترا قفس رنگیں ہے



حاصل ذوقِ ثبات کا ہو جانا
کلفت میں مسرّت آشنا ہو جانا
ہے طبعِ شگفتہ کا نرالا اعجاز
زنداں میں ترا غزل سرا ہو جانا!

پھر قیدِ فرنگ کا زمانہ آیا
آزاد کی رہ میں قید خانہ آیا
زنداں میں سنی جو بیڑیوں کی جھنکار
لب پر ترے عشق کا ترانہ آیا!



کب نغمۂ دل نوازِ زنداں میں رہا
یا نالۂ جاں گدازِ زنداں میں رہا
چرچا اس بات کا رہے گا برسوں
حسرت سا سخن طرازِ زنداں میں رہا

بہ مقام دہلی

۱۹۱۶ء میں مکرمی منشی مہاراج بہادر برقؔ مرحوم سے ملنے دہلی آیا تو حضرات مہرؔ، رونقؔ، کیفیؔ، وفاؔ وغیرہ سے ملنے کا بھی اتفاق ہوا۔ پھر ۱۹۴۱ء میں دہلی آیا تو یہ تمام حضرات انتقال فرما چکے تھے۔ (محروم)

پچیس برس کے بعد آیا دہلی
دیکھی بدلی ہوئی سراپا دہلی
رونقؔ ہے، نہ برقؔ ہے نہ ہیں مہرؔ و وفاؔ
آتی ہے نظر مثالِ صحرا دہلی

۱؎ منشی چندر بھان کیفیؔ

رہتے تھے کبھی مہر و وفا دہلی میں
تھا جلوۂ برق رونما دہلی میں
کیفی کے بغیر یہ فضا ہے بے کیف
رونق جو نہیں تو کیا رہا دہلی میں



تیغِ غمِ رفتگاں کا ہوں سینہ فگار
حیران کھڑا ہوا ہے سرِ راہگذار
اے جلوۂ برق تو کہاں ہے روپوش
دہلی نظر آتی ہے مجھے تیرہ و تار

شاہوں کا مقامِ استراحت ہے یہ

یا صبحِ وطن کی شامِ غربت ہے یہ

آثارِ قدیمہ[1] اس کو تم کہتے ہو

بکھری ہوئی داستانِ عبرت ہے یہ

[1] آثارِ قدیمۂ دہلی

مولانا تاجور نجیب آبادی

کو

مبارک باد

اعزازِ فلک نشاں مبارک ہو تجھے

توقیر کا آسماں مبارک ہو تجھے

شمس العلماء کا یہ خطابِ عالی

احسان اللہ خاں مبارک ہو تجھے!

اے تاجورِ مملکتِ شعر و سخن
ہے ذات تری علم و ادب کا مخزن
زیبا ہے ترے لئے، مبارک ہو تجھے
شمس العلماء کا یہ خطابِ روشن

قحطِ بنگال

۱۹۴۳ء

یہ قحط نہیں قہرِ خدا ہے کوئی
نیرنگِ مظالمِ قضا ہے کوئی
سرسبز ہیں کھیت، منڈیاں ہیں بھرپور
یہ قحط نہیں اور بلا ہے کوئی!

کٹواتے ہیں سر جا کے جو یلغاروں میں
لکھواتے ہیں نام اپنا وُہ سرداروں میں
آتے ہیں کِس شمار میں وُہ بیکس
جو بھُوک سے مر جاتے ہیں بازاروں میں



ہوتے ہیں کہیں ضیافتوں کے ساماں
انواعِ نِعَم سے جگمگاتے ہیں خواں
دم توڑتے ہیں کہیں بچارے بھُوکے
فریاد کناں برائے یک لقمۂ ناں!

سالگرہ آزادی

ساعت پسِ مدّت آئی ہے شادی کی
منزل پیشِ نظر ہے آبادی کی
یارب تا حشر واپس آئے ہر سال
یہ سالگرہ وطن کی آزادی کی

آزاد ہُوا وطن، مبارک اے دِل
ہو گا رشکِ چمن، مبارک اے دِل
دھو ڈالی ہے بارانِ کرم نے یکسر
گردِ رنج و محن، مبارک اے دل!

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفیؔ

اٹھاسیویں سال گرہ پر

ناظم ہیں عاشق کلام کیفیؔ
ناثر ہیں پیرو نظام کیفیؔ
ایوانِ ادب کے ہیں یہ نامی معمار
نقشِ در و دیوار ہے نام کیفیؔ

بتقریب یومِ شہیدانِ سرحد

جو ظلم کبھی نہ دہرِ فانی میں ہُوا
انگریز کے دَورِ حکمرانی میں ہُوا
ہے جور و ستم کی داستانوں کا نچوڑ
جو کچھ بازارِ قصّہ خوانی میں ہُوا

اہلِ صدق و صفا ہیں مجبور اب تک

دورِ کذب و ریا رہے گا کب تک

آزادئ ہند کے نہیں ہم قائل

عبد الغفّار خاں ہے قیدی جب تک



ہے دردِ وطن تلاشِ درماں میں ابھی

اے شافئ غم کسر ہے احساں میں ابھی

آزاد وطن ہوا تو کیا خاک ہوا

عبد الغفّار خاں ہے زنداں میں ابھی!

متفرقات

راولپنڈی

۱۹۳۳ء

نظّارۂ سرو و سمن اس شہر میں ہے
بوٹا سا ہر اک گلبدن اس شہر میں ہے
یہ شہر بسا ہُوا چمن میں ہے، یا
خاصیّتِ خاکِ چمن اس شہر میں ہے!

(ستمبر ۱۹۴۷ء میں)

راولپنڈی کو اے بسانے والو!

جنّت اِس شہر کو بنانے والو!

ویرانی دیکھ جاؤ اِس کی آ کر

راولپنڈی کو چھوڑ جانے والو!



گلیاں برباد اور کوچے ویراں

دہشت زدہ چوک اور سڑکیں سنساں

خاموش مکانوں کے دریچے دیکھو

جیسے کسی غم زدہ کی چشمِ حیراں!

راولپنڈی سے روانگی

۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محرُوم
ما من پیشِ نظر نہ منزل معلُوم
ہنگامِ وداع ہم نے دیکھا اُس کو
حسرت زدہ، دل شکستہ، حیراں، مغمُوم!

جالندھر میں

نومبر ۱۹۴۷ء

ہم رہتے تھے آرام سے اپنے گھر میں
اب گردشِ ایّام سے ہیں چکّر میں
لاہور میں جا ملی نہ امرت سر میں
پھرتے ہیں کس مپرس جالندھر میں!

بازدیدِ وطن

نومبر ۱۹۵۳ء میں مصنّف کو راولپنڈی جانے کا اتفاق
ہوا۔ یہ رباعیات اسی سفر کی یادگار ہیں

پھر اپنے وطن کی ہے فضا پیشِ نظر
اک عالمِ نَو ہے جا بجا پیشِ نظر
گُزری ہوئی عُمر پھر پلٹ کر آئی
نیرنگِ طلسمات ہے یا پیشِ نظر!

جاں وقفِ الم ہے اور فروزاں بھی ہے
دل مائلِ تسکیں بھی، پریشاں بھی ہے
راولپنڈی میں آکے محرومِ حزیں
فریاد کناں بھی ہے غزل خواں بھی ہے!



اے صبحِ وطن تری صباحت ہے اور
رقصاں ہر اک کرن میں طلعت ہے اور
نظّارے سے تیرے آج معلوم ہُوا
صبحِ وطن اور، صبحِ غربت ہے اور!

اے شامِ وطن تری ملاحت ہے اَور
دامن میں ترے سکونِ راحت ہے اَور
دیکھا تجھے اور دل سے آواز آئی
شامِ وطن اَور، شامِ غربت ہے اَور!



جو حسرتِ دید تھی خلش گر ہیم
نکلی دلِ بے تاب سے، لیکن کم کم
جیتے ہیں تو پھر سہی عزیزانِ وطن
جاتے ہیں، مسافرانہ آئے تھے ہم!

برسات اور مہاجر

دنیا کے لئے ہے راحتِ جاں برسات
پیغامِ نشاط، عیش ساماں برسات
خانہ برباد، بدنصیبوں کے لئے
لے آئی ہے اشکِ غم کا طوفاں برسات!

ایسا ہی کچھ انتظام دُنیا کا ہے

مظلُوم پہ ظُلم پے بہ پے ہوتا ہے

جھڑیاں بادل کی خانہ ویرانوں پر

بالائے سِتم سِتم نہیں تو کیا ہے!



بن کر عاشق کا دیدۂ تر برسو

چاہو تو شب و روز برابر برسو

بے سقف و در و بام پڑے ہیں جو یہاں

دیکھو، اے بادلو نہ اُن پر برسو

ترجمۂ وید منتر

اے خالقِ کائنات والے منبعِ نور!

(اپنی یہی التماس ہے تیرے حضور)

جس چیز میں خیر ہو، عطا کر ہم کو

شر سے ہمیں اور شر کو ہم سے رکھ دور!

مہاراج بھرتری کے (۲) دو شلوک

آنکھوں پہ نفس نے جو ڈالا پردا
یکسر نظر آئی شاہدستاں دُنیا
جب سُرمۂ معرفت لگایا ہم نے
تھی چار طرف ذاتِ احد جلوہ نما!

(۲)

ہم کرتے ہیں سب دیوتاؤں کو مدام

لیکن ہیں دیوتا مشیّت کے غلام

قانونِ عمل کی ہے مشیّت پابند

اے شانِ فضیلتِ عمل! تجھ کو سلام

ترجمۂ رباعئ بیدلؔ

کوئی ہے تمنّائے زر و مال میں خُوش
کوئی ہے تماشائے خط و خال میں خُوش
بیدلؔ سب کو بہ حالِ ابتر دیکھا
خوش حال وہی ہے جو ہے ہر حال میں خُوش!

گندم کی کمیابی پر

ہرگز نہیں دُور بیں نگاہِ انساں
روشن تقدیر پر ہے راہِ انساں
تقدیر نے گندم کو کیا ہے کمیاب
گندم تھی باعثِ گناہِ انساں!

یادگارِ جنگ

چشمِ عُشّاق سے فزوں تر برسو
جی بھر کر روز و شب برابر برسو
بھڑکی ہوئی ہے آتشِ پیکار یہاں
برسو اے بادلو! زمیں پر برسو!

جنگ باز

(دوسری جنگِ عظیم میں مہاتما گاندھی نے لڑائی بند کرانے کی کوشش کی۔ جنگ بازوں نے اس کی مخالفت کی)

گاندھی جی لڑائی کو بُرا کہتے ہیں
ظاہر ہے بُرائی کو بُرا کہتے ہیں
حیرت ہے تو ان کی عقل پر ہے جو لوگ
دُنیا کی بھلائی کو بُرا کہتے ہیں!

حاجی لق لق کے نام

(اُن کے ایک خط کے جواب میں)

کیا لینا اب وطن سے اور کیا دینا
یاد اُس کی ہے اپنے دل کو تڑپا دینا
لاہور سے جب تم اے کُلنگو! گزرو
لق لق کو مرا سلام پہنچا دینا!

دُعا

دُنیا میں سعادت ہو میسّر تجھ کو
رکھّے محفوظ ذاتِ برتر تجھ کو
اے نورِ مظہر[1]! دُعا یہی ہے میری
حاصل ہو فروغِ ماہ و اختر تجھ کو!

[1] فرزندِ مصنّف جگن ناتھ آزاد

دو آتشہ

(عمرؔ خیّام کی چند رباعیوں کا ترجمہ)

ہر خار جو زیرِ پائے ہر جیواں ہے
وہ زُلفِ صنم ہے ابروئے جاناں ہے
ہر خشت جو ہے کُشگرۂ ایواں پر
انگشتِ وزیر یا سرِ سُلطاں ہے !

جس نے دامانِ عقل کو تھام لیا
ہر لحظۂ زیست سے بڑا کام لیا
یا جانِ رضائے خالقِ پاک میں دی
یا ساقیٔ دل نواز سے جام لیا!



دُنیا میں برگزیدہ جو انساں ہیں
افلاک پہ جن کے وَلوَلے جولاں ہیں
وہ معرفتِ ذات میں مانندِ فلک
سرگشتہ و سرنگون و سرگرداں ہیں

ہُشیار کہ روزگار ہے شور انگیز
بے خوف نہ بیٹھ، تیغِ دوراں ہے تیز
حلوا ترے مُنہ میں دے زمانہ بالفرض
ہرگز نہ نگل اُسے کہ ہے زہر آمیز!



گر شہوت و حرص سے نہ باز آئے گا
دامن اُمیّد کا تہی پائے گا
کچھ سوچ بھی کیا ہے تُو؟ کہاں سے آیا؟
اعمال ہیں کیا ترے؟ کہاں جائے گا؟

جو لوگ محیطِ فضل و آداب ہوئے
علم اور خرد میں شمعِ اصحاب ہوئے
کب اس شبِ تاریک سے باہر نکلے
افسانہ سُنا کے مائلِ خواب ہوئے!



بیگانہ اگر وفا کرے، خویش ہے وُہ
گر خویش جفا کرے بد اندیش ہے وُہ
گر زہر موافق ہو تو ہے وُہ تریاق
ہو نوش مخالف تو سمجھ نیش ہے وُہ!

جِس دشت میں لالہ زار ہو جلوہ نما

وُہ لالہ لہُو کسی جواں کا ہو گا

ہر برگِ بنفشہ جو زمیں سے پھُوٹا

ہے خال کِسی نگار کے چہرے کا!



ممکن نہیں بے شراب میں زندہ رہُوں

یا بن پیئے بارِ تن اُٹھاؤں یہ سکُوں

وہ وقت کب آئے گا کہ ساقی یہ کہے

لے جام اک اَور، اَور میں لے نہ سکُوں!

به زبانِ فارسی

هستم بہ جہاں اگرچہ غرقِ عصیاں

دارم امیدِ رحمتش در دل و جاں

دانندۂ ہرچہ در ضمیرم گزرد

بینندۂ ہرچہ کردہ باشم پنہاں!

در کُنہِ رموز راہ نتوانم کرد
بر کارِ فلک جُز آہ نتوانم کرد
یکسر سرِ من سفید گردید، ولے
یک مُوئے ازاں سیاہ نتوانم کرد!



بیدادگرے کہ خونِ ناحق ریزد
با خالقِ داد گر، ہمی بستیزد
ہر قطرۂ خونِ بیگناہانِ غریب
تخمے است کہ نخلِ حُرّیت زو خیزد!

ایک دوست نے لاہور سے نرگس کے پھول بھیجے
رستے میں کمھلا گئے۔ یہ رباعی ان پھولوں کی
رسید میں لکھی گئی

اے دوست چہ گویمت کہ نرگس چوں مُرد
واں تازگیش ہوائے دَوراں چوں بُرد
لاریب رسید تا بہ ایں جا شاداب
چشمے بر حالِ من کُشود و افسُرد!

ہم خانۂ من کہ پنج اعدائے من اند
موجود بہ بیداری و رؤیائے من اند
از دستِ فریبِ شاں رہانم یارب!
ہمدم شمارہ مستعد بہ ایذائے من اند!

لہ شہوت[1]	غضب[2]	حرص[3]	دل بستگی[4]	خودی[5]
کام	کرودھ	لوبھ	موہ	اہنکار

حضرت جوشؔ ملیانی نے دو فارسی غزلوں پر جو "الحمرا" لاہور میں شائع ہوئیں، نکودر سے اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

با جوشؔ دمیکہ شد میسّر مارا
از عُمرِ عزیز بُود خوشتر مارا
کم یافتہ ایم ازیں نکوتر تحسیں
دادِ سخن آمد از نکودرؔ مارا

تہیدست از جہاں رفتند شاہاں
بہ عالم بے نشاں عالم پناہاں
بہ دہر اندر تغیر ازمی سیر گیر
اگر بینی مآلِ کج کُلاہاں!

بیکراں

جگن ناتھ آزاد کا پہلا مجموعۂ کلام

جگن ناتھ آزاد اُن چند پھولوں میں سے ہیں جنہیں فساد کی آندھی پاکستان سے ہندستان اُڑا لائی اور جو اب ہمارے ملک میں مہک رہے ہیں۔ میں نے یہ تشبیہہ قصداً اس لئے استعمال کی کہ آزاد کی شاعری واقعی ایک خاص مہک رکھتی ہے۔ مشامِ جاں تک پہنچنے والی اور قلب کی تہوں میں بس جانے والی۔ آزاد کا کلام پڑھنے کے بعد سب سے پہلے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ اس کی شاعری کا مقصود صرف انسانیت پرستی ہے، اس کے پا لینے کے لئے وہ بے تاب ہے۔ وہ خارجی حالات کی ترجمانی کرتا ہے لیکن خود اپنے تاثرات کو سامنے رکھ کر، اور اسی لئے اس میں خاص اثر ہے۔ وہ دنیا کا مطالعہ اس زاویۂ نگاہ سے نہیں کرتا کہ قدرت کی ستم ظریفیوں کے سامنے سپر ڈال دینا پڑے بلکہ وہ اس کی وسعت کو سمیٹ کر ہمیں جائے امن و جلائے تو باشندہ بنا لینا چاہتا ہے تاکہ ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں۔ آزاد کے کلام میں ہمیں کسی جگہ کوئی پست و رکیک چیز نہیں ملتی۔ وہ ہر بات پر عام سطح سے بلند ہو کر غور کرتا ہے اور اسے ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس سے رجائی کیفیت ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اس کا کلام دردناک نہیں بلکہ دردمندانہ ہے۔ اس کے یہاں شور و ہنگامہ نہیں بلکہ نرمی و سکون ہے۔ وہ پیشانی پر شکنیں ڈال کر شعر نہیں کہتا۔ وہ جلی کٹی اور طنز و تشنیع سے کام نہیں لیتا۔ اُس کے یہاں خاص قسم کی متفکرانہ سنجیدگی ہے۔ غصہ و غم کو پی جانے کی کیفیت ہے اور یہ بڑی چیز ہے۔ وہ نظم و غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتا ہے اور دونوں کی فنی خصوصیات کو سامنے رکھ کر شعر کہتا ہے۔

نیاز فتحپوری

نیا ایڈیشن — چار روپے آٹھ آنے

رسالہ بیسویں صدی نئی دہلی

ستاروں سے ذرّوں تک

آزاد کا دُوسرا مجموعۂ کلام

جگن ناتھ آزاد نے ادب میں اجتماعی محبت کی بو باس پیدا کی ہے۔ اس کی محبت کا دائرہ وسیع ہے اور وہ دُنیا بھر کے اِنسانوں میں رواداری اور آشتی دیکھنے کا متمنّی ہے۔ اس کے تخیّل کا محور شخصی اور ذاتی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا نظامِ زندگی چاہتا ہے جس میں سچّی اخوّت اور مساوات ہو۔ اس کی شاعری میں ایک جمالیاتی شان بھی ہے جو میرے نزدیک اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ وہ ماضی کی عظمت کا قائل ہے اور اس سے استفادے کو فن کی عظمت کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ اس کی شاعری نئی ہے اُس کی شش جہت اور اُس کا زاویۂ نظر ماضی سے یکسر مختلف ہے لیکن اُس میں ماضی کی حُسن آفرینی اور نزاکت بھی ہے۔

خواجہ احمد فاروقی

(نیا ایڈیشن)

قیمت دو روپے بارہ آنے

رسالہ بیسویں صدی نئی دہلی





اُردو

ایک تاریخی مثنوی

نیا ایڈیشن

آزاد کے کلام کا اس قدر گہرا اثر میرے دل پر اس لئے پڑا ہے کہ وہ ۱۹۴۷ء کے فرقہ واری فتنہ کی آگ میں گزر کر اور آوارہ وطن ہو کر ہندستان آئے اور پھر بھی ادنیٰ تعصبات کی اس گندگی سے انہوں نے اپنا دامن بچایا جس سے آج بہت سے دامن آلودہ ہیں۔ یہ شخصی کردار کا ایک بہت بلند مقام ہے!! ایک ایسے شاعر کی آواز کو محض شاعرانہ سخن آرائی تو نہیں کہہ سکتے! وہ تو غیب کی آواز ہے، وہ تو زندگی کی ایک نوید ہے!

یہ نظم اردو زبان کے متعلق آزاد کی بلند نظری کا ایک نقش ہے اور اس میں ہمیں اس حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے کہ اُردو ہمارے ملک کی مشترکہ زبان تھی اور ہے، اس چہرے کو آج ہمارے ملک کے بہت سے لوگ دیکھنا پسند نہیں کرتے، لیکن تاریخ اور زندگی کی حقیقتوں سے آنکھ بند کرکے انکار کر دینا اُن کو باطل نہیں کر سکتا!

آزاد کی ذہنی زندگی روشن اور تاباں ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسی ہی رہے گی، گرد و غبار سے پاک! اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ ان کے چراغ سے ہزاروں چراغ ہمارے عزیز وطن میں روشن ہوں گے اور ایک دن آئے گا کہ اس ملک میں شاعروں کی شاعری اور ادیبوں کا ادب عوام کی زندگی کا اس طرح آئینہ دار ہوگا کہ پھر عکس کو آئینہ سے جدا نہ کیا جا سکے گا۔

(قاضی) محمد عبد الغفار

قیمت - آٹھ آنے

رسالہ بیسویں صدی نئی دہلی